واللہ المستعان علی ما تصفون

سلسلۂ حالاتِ نظر بندانِ اسلام، حسرت موہانی پر لکھی گئی سب سے پہلی سوانح

نمبر (۳)

حالاتِ حسرت

جس میں عہد دستور مولانا سید فضل الحسن صاحب حسرتؔ موہانی (بی اے)

علیگ کی سوانح عمری و مکمل حالاتِ اسیری درج ہیں

مصنف:

مولانا محمد عارف ہنسوی

ولادت: ۱۸۸۵ء وفات: ۱۲؍جنوری ۱۹۳۶ء

جس کو صدر دفتر ''انجمن اعانت نظر بندانِ اسلام دہلی'' نے

۱۳۳۷ ہجری مطابق ۱۹۱۸ء، پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا

ترتیب جدید اور حواشی:

محمد جنید قاسمی گنج مرادآبادی

استاذ شعبۂ عربی مدرسہ مفتاح العلوم گنج مرادآباد

تفصیلات

نام کتاب : حالاتِ حسرت

مصنف : مولانا محمد عارف ہنسوی

ترتیب جدید وحواشی: محمد جنید قاسمی مدرس شعبۂ عربی
مدرسہ مفتاح العلوم گنج مرادآباد (یوپی)

صفحات :

کتابت : ایم۔انظار الحسن قاسمی (غوث گنج، بہردوئی)
استاذ: مدرسہ قاسم العلوم تیوڑہ، مظفرنگر

تصحیح کتابت: مفتی محمد احسان قاسمی مدرس شعبۂ عربی
مدرسہ مفتاح العلوم گنج مرادآباد (یوپی)
9559327234

اشاعت اول: ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء (مجلس نظر بندانِ اسلام دہلی)

اشاعت جدید: ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۰۱۸ء

ناشر:
مولانا علی حسنؒ اکیڈمی، محلّہ انصار میدان، گنج مرادآباد ضلع اناؤ (یوپی)
9369648963

تقسیم کار:

فہرست

مضامین	صفحہ
سوانحی خاکہ (مولانا محمد عارف ہنسوی رحمۃ اللہ علیہ)	۵
حالاتِ حسرت کی پہلی طباعت اور کچھ کتاب کے متعلق	۶
آفریں صد آفریں	۸
پیش لفظ	۱۱
اس کتاب میں کام کی نوعیت	۱۲
مولانا محمد عارف ہنسوی کا تذکرہ	۱۴
موہان کی تاریخی حیثیت	۲۱
سوانحی خاکہ مولانا حسرت موہانی	۲۳
مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی بی، اے	۲۴
ابتدائی اور طالب علمی کے حالات	۲۴
علمی سفر اور آپ کے اساتذہ	۲۴
حسرت فطرتاً شاعر پیدا ہوئے (مرتب)	۲۵
دور ثانی اور قومی خدمات	۲۸
حسرت کی سیاسی مشغولی	۳۰

دورابتلاءوآزمائش کا آغاز ۳۲
آغازِ قید کا حال (مرتب) ۳۴
نینی جیل (مرتب) ۳۵
برکات السجن (یعنی قید فرنگ کی روحانی برکتیں) (مرتب) ۳۷
ابتلاءوآزمائش کے بعد ۴۲
مولانا حسرت کی پالیسی ۴۳
حسرت کا عزم واستقلال اور ایثار وفدویت ۴۶
سودیشی تحریک اور حسرت ۴۹
تعلیمی تحریک اور حسرت کی مساعی ۵۲
مولانا حسرت کا مذہب ومشرب ۵۴
بیعت وارشاد (مرتب) ۵۶
متفرق حالات ۵۷
حسرت کی ادبی خدمات ۵۹
حسرت کی چند خصوصیات ۶۰
ابتلاءوآزمائش کا دورِ ثانی ۶۴
موجودہ اسیری کے متعلق متفرق واقعات ۸۲
آخری حالات ۸۸

سوانحی خاکہ

مولانا محمد عارف ہنسوی رحمۃ اللہ علیہ

نام: مولانا محمد عارف ہنسوی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت: ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۲ھ

والد کا نام اور بیعت و ارشاد: مرحوم عبدالخالق، شاہ عبدالسلام سے بیعت تھے، اخیر عمر میں امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بھی استفادہ کیا۔

خیالات: مولانا محمد عارف ہنسوی ایک سچے، دیندار اور صوفیانہ خیالات کے آدمی تھے۔

مرض: پان کھانے کی وجہ سے گلے میں کینسر ہو گیا تھا اور پچاس سال کی عمر میں کینسر کا شکار ہو گئے تھے۔

وفات: ۱۲ر جنوری ۱۹۳۶ء مطابق ۱۷ر شوال المکرم ۱۳۵۴ھ

نماز جنازہ: مفتی اعظم مفتی کفایت اللہؒ نے پڑھائی۔

مدفن: قبرستان دہلی گیٹ میں دفن ہوئے۔

حالاتِ حسرت کی پہلی طباعت اور کچھ کتاب کے متعلق

حالات حسرت کی تھوڑی سی جھلک ''پیش لفظ'' میں ذکر کی گئی ہے، تاہم کچھ وضاحت کے ساتھ یہ تحریر فائدے سے خالی نہ ہوگی، کتابِ مذکور مولانا حسرت موہانی کی اسارت کے دوران ۱۹۱۶ء میں لکھی گئی اور اس کتاب کو انجمن نظر بندانِ اسلام نے ۱۹۱۸ء مطابق ۱۳۳۷ھ میں شائع کیا، پھر اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں ''اردوئے معلّٰی'' نے ضمیمہ کے طور پر شائع کیا، مولانا حسرت موہانی میموریل اینڈ ہال ٹرسٹ کراچی نے ۱۹۹۳ء دوسری مرتبہ شائع کیا، راقم الحروف کے پیش نظر پہلی اشاعت کا نسخہ ہے، پہلی اشاعت کے نسخے میں نہ ٹائٹل پر مصنف کا نام درج ہے، صرف ذیلی عناوین قائم ہیں، شروع میں فہرستِ مضامین نہیں ہے، دسمبر ۲۰۱۰ء کی بات ہے کہ کاتب الحروف جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں عربی ششم کا طالب علم تھا، اس وقت ماہنامہ ''بزم سہارا'' میں اردو کے مشہور و معروف ادیب جناب حقانی القاسمی کا مضمون ''اناؤ کا تخلیقی الاؤ'' کے نام سے شائع ہوا تھا، مضمون قدرے طویل لیکن دلکش تھا، مضمون تاریخی لحاظ سے معلومات کا جامع اور حسین مرقع تھا، اس مضمون میں ''مولانا حسرت موہانی'' پر بھی ہنوک قلم کچھ تحریر کیا گیا تھا، اسی مضمون میں مولانا حسرت موہانی پر شائع ہونے والی سب سے پہلی سوانح عمری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

کاتب الحروف اس سوانح عمری کی تلاش و جستجو میں لگ گیا، لیکن تلاش بسیار کے بعد بھی نسخہ ہاتھ نہ لگا، بمشکل اس کی پی ڈی ایف فائل مل گئی، چونکہ اس ناچیز کو بزرگوں کی سوانح اور ان کے تذکرے، ان کے مخطوطات اور مکتوبات کا بہت ذوق و شوق ہے، ارادہ کرلیا تھا کہ ان شاء اللہ اس کتاب کو شائع کریں گے، پروردگار کا بے پایاں کرم اور فضل ہے کہ آج، کم و بیش ۸ رسال کے بعد اس کی توفیق ملی اور کتاب آپ کے ہاتھ میں پہنچ گئی۔

کتاب کمپوز ہونے تک اصل کتاب سے استفادہ نہ ہوسکا، لیکن جب کتاب کمپوز ہوگئی، ہمارے رفیق محترم مولانا محمد ارشد قاسمی اریاوی متعلم شعبۂ انگریزی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ذریعہ سے اصل کتاب کی مکمل فوٹو کاپی دستیاب ہوئی، پھر کتاب کی تصحیح اصل کتاب سے کی۔

حالاتِ حسرت مجلس نظر بندانِ اسلام دہلی میں پہلی مرتبہ ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۱۸ء چھپی، یہ نسخہ قسط وار ''نگار'' لکھنؤ اور ''اردوئے معلّٰی'' میں چھپنا شروع ہوا تھا، اسی طباعت کا عکس ہمارے ذخیرے میں محفوظ ہے۔

واضح رہے کہ یہ نسخہ انٹرنیٹ پر پی ڈی ایف کی شکل میں دستیاب ہے، لیکن وہ کئی وجوہ سے ناقابل استفادہ ہے:

(۱) اس کے فوٹوز کس کتاب سے لیے گئے ہیں یہ بھی توجہ طلب امر ہے۔

(۲) صفحہ نمبر بھی نہیں درج ہے۔

(۳) بعض صفحات تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ بھی نہیں سکتے۔

محمد جنید قاسمی

۲۰ر محرم الحرام ۱۴۴۰ھ

یکم اکتوبر ۲۰۱۸ء بروز دوشنبہ

آفریں صد آفریں

حسرت موہانی جنہیں اہل زمانہ ان کے اصل نام فضل الحسن سے کم ہی جانتے ہیں، مجھے ایم اے کی تیاری کے دوران تقریباً ۳۵ ربرس قبل ان کی شاعری سے شغف ہوا، غزلیں پڑھتا جاتا اور کیف وسرور میں ڈوبتا جاتا، بہت سی غزلیں ازبر ہوگئیں، بہت سے اشعار دوستوں سے ملاقاتوں کے دوران اچانک زبان پر آجاتے، ان کے اشعار پڑھ کر دل کو یک گونہ سکون محسوس ہوتا، ان کے حالاتِ زندگی پڑھے تو اس وقت کے مزاج کے مطابق بات ان کی شاعری سے آگے نہ بڑھ سکی۔

کئی برس کے بعد جب پی ایچ ڈی کا موقع میسر آیا اور موضوع ''تحریک خلافت اور مسلم صحافت'' منتخب کیا گیا تو ''اردوئے معلّٰی'' جو حسرت موہانی کا اہم اخبار تھا، پڑھنے کا موقع ملا، موضوع سے متعلق اس وقت کے دیگر اخبارات ''الہلال، البلاغ، ہمدرد'' اور ''زمیندار'' کے مطالعے کا موقع ملا تو یہ عقدہ کھلا کہ مولانا تو سراپا اور مجسم آزادیٔ ہند کے علم برداروں کی پہلی صف میں شامل ہیں، پھر جیسے جیسے مطالعہ کرتا گیا، ان کی زندگی کے مختلف نشیب وفراز مجھ پر منکشف ہوتے گئے، اپنی کتابیں ''تحریک خلافت اور جدوجہد آزادی''، ''آزادیٔ ہند''، ''تحریک خلافت'' میں حسرت موہانی کی ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد اور اس دوران انہوں نے جو چکی کی مشقتیں اٹھائیں اور ناقابل یقین جیل کی صعوبتیں برداشت کیں وہ تاریخ کا ایک سنہری باب ہیں۔

برادرم مفتی محمد جنید قاسمی نے جب ''حالات حسرت'' کے لیے چند سطور رقم کرنے کا مطالبہ کیا تو ان کی زندگی کے بہت سے نقوش نظر کے سامنے گھوم گئے، اپنی مختلف مصروفیات

کے باعث خود کو چند سطریں لکھنے کے لیے تیار نہیں کر پا رہا تھا، مولوی محمد جنید قاسمی کے پیہم اصرار کے تحت قلم تو اٹھا لیا لیکن مولانا محمد عارف ہنسویؒ جو حالات حسرت کے مصنف ہیں، ان کے شعلہ رقم قلم کے آگے مجھ ہیچمدان کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کچھ لکھوں، بہر حال کسی طرح حوصلہ پا کر خیال خاطر احباب کے تحت اس عظیم مجاہد آزادی حسرت موہانی اور حالات حسرت کے مصنف مولانا محمد عارف ہنسویؒ کو خراج عقیدت کے طور پر چند سطریں تحریر کر رہا ہوں۔

مفتی محمد جنید قاسمی نے اس کتاب کو نئے انداز میں اس طرح مرتب کیا ہے کہ یہ ایک مستقل تصنیف کے زمرہ میں رکھی جانی چاہیے، ساتھ ہی انھوں نے مولانا محمد عارف ہنسوی کا سوانحی خاکہ پیش کر کے انہیں اس حلقے میں متعارف کرایا ہے جو یا تو انہیں جانتے نہیں یا پھر بھول بیٹھے ہیں، پھر کتاب میں تحقیق وتحشیہ کا ان کا منفرد اور مربوط و منظم انداز کتاب کو ایک وقار عطا کرتا ہے۔

مولانا محمد عارف ہنسویؒ نے جس طرح مولانا حسرت موہانی کے ساتھ درویشانہ اور صوفیانہ زندگی گزاری اور ہر ہر قدم پر جہاد آزادی کے لیے ان کے ساتھ کمر بستہ رہے، اس لیے ان کے پر جوش خیالات نے حالات حسرت کو منتخب روزگار کتاب بنا دیا ہے، اس لیے کہ برطانوی استعمار کے خلاف جو تیور مولانا حسرت موہانی رکھتے تھے، کچھ اسی طرح کے جوش وجذبات مولانا محمد عارف ہنسوی میں بھی موجود تھے۔

اس کتاب کے مشمولات میں موہان کی تاریخ بھی رقم کی گئی ہے، حسرت موہانی کے ابتدائی اور طالب علمی کے حالات رقم کرتے ہوئے یہ بتایا گیا کہ وہ اپنے اندر ایسے آثار وعلائم رکھتے تھے کہ ان کی آئندہ ترقی اور فروغ کے احکامات آسانی سے تلاش کیے جا سکتے تھے دور ثانی اور قومی خدمات کے تحت اردوئے معلیٰ کی سیاسی اور ادبی خدمات پر گفتگو کی گئی ہے اور یہ

سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج جو غفلت شکن اور بیدار کن سیاسی روح مسلمانوں میں [جو بھی] پائی جاتی ہے اس کا پہلا واعظ حسرت موہانی اور ان کا رسالہ ''اردوئے معلّٰی'' ہے۔ حسرت کی سیاسی مشغولیت کے دور کا بھی تذکرہ ان کے شایانِ شاں اور ان کی گرانقدر خدمات کے اعتراف کے ساتھ کیا گیا ہے، جس سے اس کتاب کی وقعت میں اضافہ ہوتا ہے، پھر اس کے بعد دور ابتلاء و آزمائش کا آغاز، حسرت موہانی کی پالیسی، حسرت کا عزم و استقلال اور ایثار و فدائیت، سودیشی تحریک اور حسرت، تعلیمی تحریک اور حسرت کی مساعی، حسرت کا مذہب و مشرب، متفرق حالات، حسرت کی ادبی خدمات، حسرت کی چند خصوصیات، ابتلاء و آزمائش کا دور ثانی اور متفرق واقعات کے تحت مولانا محمد عارف نے جو بھی وہ کہنا چاہتے تھے اس کو بڑے مؤثر انداز میں رقم کر دیا ہے، بلکہ یہاں حسرت کی گرفتاری کے بعد پولیس افسر سے ان کا جو مکالمہ ہوا اور تلخ کلامی تک بڑھ گیا ہے، اس کو بھی نقل کر دیا ہے اور مقدمہ کی تاریخیں بھی بیان کی ہیں جس سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ راقم کا خیال ہے کہ پولیس افسر سے اس طرح کا مکالمہ شاذ و نادر ہی سامنے آیا ہے۔ مصنف علیہ الرحمہ نے جو کچھ حسرت موہانی سے متعلق جانتے تھے بلا کم و کاست بیان کرنے کی جو سعی کی ہے وہ قابل ستائش ہے، ساتھ برادرم محمد جنید قاسمی نے جتنی باریک بینی سے کتاب کے متعلقات کی چھان پھٹک کی ہے اس کی بہر حال قدر کی جانی چاہیے۔

میری دعا ہے کہ برادرم محمد جنید قاسمی تحقیق و تشریح اور تحشی کے کام میں آگے آ کر اگر مزید کام کریں اور تاریخ جو میرا بھی ایک اہم موضوع ہے اور برادرم جنید کو بھی اس سے دلچسپی ہے، وہ ایسے شواہد سامنے لائیں جو عوام تو عوام بلکہ اہل علم کی نگاہوں سے بھی ابھی تک مخفی ہیں۔

دست بدعا: منور حسن کمال

۸/ اکتوبر ۲۰۱۸ء

سب ایڈیٹر: اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا دہلی

پیش لفظ

مولانا حسرت موہانی کا شمار بیسوی صدی کے نصف اول کے ہندوستان کی ممتاز ترین شخصیتوں میں ہوتا ہے، مولانا حسرت موہانی پر بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں، لیکن ہندوستان میں جو کتاب کسی اہم موضوع پر شائع ہوتی ہے تو دوبارہ ناشرین اس کی طرف توجہ نہیں دیتے، کچھ ایسا ہی حال حسرت موہانی پر لکھی گئی کتابوں کے ساتھ ہوا، کاتب الحروف کی ناقص رائے اور کم علمی کی وجہ سے یہ بات لکھنے میں دریغ نہیں ہے کہ حسرت موہانی پر تین کتابیں سب سے جامع اور معلومات کا خزینہ ہیں: (۱) ''حالات حسرت'' (۲) ''حسرت موہانی، حیات و کارنامے'' (۳) سید الاحرار یہ کتاب یعنی حالات حسرت سب سے پہلے مولانا کی حیات میں ہی لکھی گئی اور ان کی حیات ہی میں شائع ہوئی، مولانا کے مشہور جریدہ اردوئے معلیٰ میں ضمیمے کے طور پر ۱۹۳۷ء میں چھپنا شروع ہوئی، مولانا حسرت موہانی کے اسارت کے دوران ۱۹۱۶ء میں ''حالات حسرت'' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا گیا، جس کو مجلس نظر بندانِ اسلام کی جانب سے کتابچے کی صورت میں شائع کیا، پھر اس کے بعد نیاز فتحپوری نے دوقسطوں میں اپنے رسالہ ''نگار'' میں شائع کروایا، اردو ادب میں مولانا عارف ہنسوی کا یہ مقالہ، حسرت موہانی کی سیاسی، صحافتی اور شعری اہمیت کو واضح کرنے میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جتنی کتابیں حسرت موہانی پر لکھی گئیں سب کتابوں میں ''حالاتِ حسرت'' کا کسی نہ کسی درجہ میں تذکرہ کیا گیا ہے، اس مقالہ کے مصنف کے بارے میں ڈاکٹر احمر لاری نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ کتاب مذکور پر مصنف کا نام درج نہیں ہے، یہ بات صحیح ہے، چونکہ مولانا عارف ہنسوی اس وقت باغیانہ لٹریچر کی وجہ سے حکومت کی نظروں میں تھے، اس لیے انجمن نظر بندانِ اسلام نے مصلحتاً ان کا

نام شامل نہیں کیا، البتہ دوسرے قرائن اور اطلاعات وشواہد کی بنیاد پر صد فی صد یہ بات بالکل درست ہے کہ اس کتاب کے مصنف مولانا محمد عارف ہنسوی ہیں، نیز پاکستان سے سید اشتیاق اظہر کے دیباچہ اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے پیش لفظ کے ساتھ ۱۹۹۳ء میں حالات حسرت شائع ہوئی، اس پر مصنف کا نام درج ہے۔

اس کتاب میں کام کی نوعیت

(۱) اصل کتاب جوں کی توں باقی رکھی گئی ہے، اگر وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی تو نمبر لکھ کر حاشیہ میں اس کی وضاحت کردی گئی ہے۔

(۲) اصل کتاب کے صرف ۲/ نسخے ''مولانا آزاد (لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں موجود ہیں، وہیں سے مکمل فوٹو اسٹیٹ حاصل کیے گئے، اس کتاب کی فوٹو کاپی ہمارے رفیق درس مولانا محمد ارشد قاسمی اریاوی کے توسط سے ملی ہے، ہم اس کے لیے موصوف کے شکر گزار ہیں۔

(۳) مولانا عارف ہنسوی اور مولانا حسرت موہانی کا تعارف اور سوانحی خاکہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

(۴) جدید املاء، رموز واوقاف کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۵) جزوی طور پر عناوین قائم کیے گئے ہیں، مصنف کے عناوین سے مرتب کے عناوین فرق کرنے کے لیے، بریکیٹ میں (مرتب) لکھ دیا گیا ہے، تاکہ اصل کتاب سے ممتاز ہوجائے۔

جناب منور حسن کمال صاحب (سب ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی) کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں کہ؛ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود میری گذارشات بروئے کار لائے، میں مفتی محمد احسان صاحب قاسمی استاذ مدرسہ مفتاح العلوم گنج مرادآباد کا

بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ موصوف نے ہمارے کہنے پر کتاب کی تصحیح اور دوسری کتابوں کے حوالہ جات نقل کرنے کا اہتمام فرمایا۔

اس موقع پر بڑی ناسپاسی ہوگی، اگر حضرت اقدس جناب الحاج حافظ محمد فرقان صاحب مہتمم مدرسہ مفتاح العلوم کے احسان کو فراموش کر دیا جائے کہ؛ انھوں نے مدرسہ ہٰذا میں تدریسی مشاغل کے باوجود مکمل یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کے لیے تمام ممکن سہولیات فراہم کیں۔

اخیر میں ان عزیز بچوں کا بھی شکر گزار ہوں، جنھوں نے پورے مسودے کو اصل کتاب سے ملا کر حرف بحرف تصحیح کی، حافظ محمد محسن قاضی پور و حافظ محمد رفیع الدین سیتاپور درجۂ اول عربی متعلم مدرسہ مفتاح العلوم گنج مرادآباد۔

اللہ ان سب کو بہترین بدلہ عطا فرمائے، فجزاہم اللہ احسن الجزاء

دہلی کے مسلمانوں نے مجلس نظر بندانِ اسلام کے نام سے ایک تنظیم قائم کر رکھی تھی، جس کا مقصد اسیرانِ فرنگ کے حالات پر معلوماتی لٹریچر شائع کر کے ملک و قوم کو آزادی کی جدوجہد کے لیے بیدار کرنا تھا۔

مفتیٔ اعظم ہند (مفتی کفایت اللہؒ) اس انقلابی انجمن کے سرپرست تھے، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان جیسے سرکردہ اصحاب، انجمن کے لیے وسائل کا انتظام کرتے تھے، اور شہر کے لائق صحافی و اہل قلم لٹریچر کی تیاری کا کام کرتے تھے۔

یہ ۱۹۱۴ء کا زمانہ تھا جب دہلی میں ملا واحدی کا ہفت روزہ اخبار ''خطیب'' اور مولانا محمد علی جوہرؒ کا تاریخ ساز اخبار ''ہمدرد'' اور دوسرے بہت سے اخبار و جرائد آزادیٔ وطن کی آواز بلند کر رہے تھے۔ (فخر وطن: از فاروق ارگلی ص: ۳۵۱، فرید بکڈپو دہلی)

محمد جنید قاسمی

۱۹ر محرم ۱۴۴۰ھ ۳۰ر ستمبر ۲۰۱۸ء بروز سنیچر

مولانا محمد عارف ہنسوی کا تذکرہ

از مرتب

مولانا عارف ہسوی ایک شعلہ رقم سیاسی کالم نویس تو تھے ہی، انھوں نے خاص طور پر ''مجلس نظر بندانِ اسلام'' کے ماہنامہ لٹریچر کی تیاری میں سرگرم حصہ لیا تھا، انھوں نے اس انجمن سے اپنی متعدد تحریریں شائع کروائیں، لیکن مولانا حسرت موہانی کی اسارت کے دوران ۱۹۱۶ء میں انھوں نے ''حالاتِ حسرت'' کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا، جو ''مجلس نظر بندانِ اسلام'' کی جانب سے کتابچے کی صورت میں شائع ہوا، یہ مقالہ دو اقساط میں نیاز فتحپوری کے رسالہ ''نقاد'' میں بھی شائع ہوا، اردو ادب میں عارف ہسوی کا یہ مقالہ ''حسرت موہانیؒ'' کی سیاسی، صحافتی اور شعری اہمیت کو واضح کرنے میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانیؒ سے مولانا عارف ہسوی کا تعلق خاطر محض فتح پوری کے مدرسہ اسلامیہ کے ساتھی اور دوست ہونے کی وجہ سے ہی نہیں تھا بلکہ انھیں حسرت موہانی کے انقلابی مزاج اور پرجوش جہادِ آزادی سے عشق تھا، وہ خود بھی اپنے وطن کی آزادی پر، مر مٹنے کے جذبے سے سرشار تھے، اب اسے وقت کی ستم ظریفی کہیں یا خود اہل وطن اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کی غفلت شعاری کہ؛ اتنے عظیم مجاہد آزادی کی یادوں کے لیے صرف ''حالاتِ حسرت'' نامی ایک فاضلانہ مقالے اور ''کلیات حسرت'' کے عالمانہ دیباچے اور ایک آدھ غزل اور چند اشعار کے علاوہ ہمارے سامنے اور کچھ بھی موجود نہیں ہے، وطن کی آزادی کے لیے ان کی تمام جدوجہد اور بے مثال قربانیوں کو فراموش یا نظر انداز کر دیا گیا، حیرت اس بات پر ہے کہ تاریخ آزادی کے مقبول عام مؤرخین نے بھی ملت اسلامیہ، اردو زبان، ادب، شاعری اور صحافت کے حوالے سے تحریک آزادی کی اس عہد

سازشخصیت کی جانب بالکل نہیں یا بہت کم توجہ دی ہے، اگر ملا واحدی کی یادگار تصنیف ''میرے زمانے کے لوگ'' مولانا عارف ہسوی کے ہم عصر اور ان کے دوست ضیاء الدین احمد برنی کی ''عظمت رفتہ'' اور مولانا امداد صابری کی ''تاریخ صحافت'' اردو میں ان کا تھوڑا بہت ذکر نہ کیا گیا ہوتا تو یہ نام بھی تاریخ کے اندھیروں میں اسی طرح گم ہو گیا ہوتا، جیسے ہزار ہا ایسی شخصیتوں کے نام صفحۂ ہستی سے ناپید ہیں، جن کی خدمات اور قربانیاں اگر سامنے ہوتیں تو تاریخ کے اکثر بڑے بڑے آفتاب و ماہتاب بے نور نظر آتے۔

کانگریس ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے، آج بھی ملک میں کانگریس کا اقتدار قائم ہے، لیکن آج کے کسی بھی باشعور اور اہم کانگریسی سے پوچھیں کہ کیا انھیں معلوم ہے کہ گاندھی جی کی تحریک کے نقطۂ آغاز اور عالم عروج کے دور میں دہلی میں ایک ایسا بھی کانگریسی رہنما تھا جو پارٹی کا ریاستی صدر منتخب ہوا تھا، اور جو کانگریس پارٹی کے آرگن روزنامہ ''کانگریس'' کا ایڈیٹر تھا، جس کا نام ''مولانا عارف ہسوی'' تھا، تو جواب نفی میں ہوگا، مجاہد آزادی اور اردو صحافت کے سب سے بڑے مؤرخ مولانا امداد صابری کی یہ تحریر شاید دنیا نے پڑھی ہی نہیں۔

مولانا عارف ہسوی کے تاریخ ساز مقالے حالاتِ حسرت کے پیش لفظ میں اس عظیم مجاہد آزادی کی شخصیت اور کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

> ''واقعہ یہ ہے کہ مولانا حسرت کی زندگی ان کے طرز فکر اور ان کے باغیانہ خیالات کی داد مولانا عارف ہسوی جیسے حکومت کے باغی، بے باک اور حریت پسند اہل قلم ہی دے سکتے تھے، مولانا عارف ہسوی کی سیاسی اور صحافتی زندگی پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں شعبوں میں مولانا حسرت موہانی کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والے آدمی تھے، ان کا ذہن برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کی آگ سے اس

طرح جل رہا تھا جس طرح مولانا حسرت موہانی کا، چنانچہ مولانا حسرت نے اپنے رسالے ''اردوئے معلیٰ'' میں برطانوی حکومت کے خلاف جس نوع کی بے باک اور حق پرست صحافت کا آغاز کر رکھا تھا، مولانا عارف ہسوی نے اسے شروع سے آخر تک برقرار رکھا، نتیجتاً مولانا حسرت کی ہی طرح ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اسیری میں بسر ہوا''

مولانا عارف ہسوی کی ولادت ۱۸۸۵ء کے آس پاس قصبہ ہسوہ ضلع فتحپور میں ہوئی، ان کے والد عبدالخالق نہایت پاکیزہ سیرت اور صوفی منش انسان تھے، مولانا امداد صابری لکھتے ہیں کہ جناب عبدالخالق ہسوی کے روحانی بزرگ شاہ عبدالسلام سے بیعت تھے، انھوں نے اخیر عمر میں فقیہ النفس حضر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بھی استفادہ کیا ہے ان پر تصوف کا اس قدر غلبہ تھا کہ اسی وجہ سے انھوں نے عارف سے پہلے جو دو تین بچے ہوئے ان کا نام عارف ہی رکھا، مگر کسی نے زندگی نہ پائی، چنانچہ جب عارف پیدا ہوئے تو ان کی والدہ کو خیال پیدا ہوا کہ یہ نام منحوس ہے اس لیے اس بچے کا نام یہ نام نہیں رکھوں گی، مگر ان کے والد مستحکم عقیدے کے بزرگ، انھوں نے اس بات پر توجہ نہیں دی اور ان کا نام بھی متوفی بھائیوں کے نام پر عارف ہی رکھا، خدا نے ان کو زندگی دی، عارف ہسوی نے اس زمانے کے اشراف کے رواج کے مطابق عربی، فارسی، اردو اور مذہبیات کی تعلیم حاصل کی، فتحپور کے مدرسہ اسلامیہ میں سید فضل الحسن حسرت موہانیؒ کے ساتھ تعلیم پائی، بعد میں مولانا حسرت موہانی انگریزی تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے تھے، عارف ہسوی بچپن سے ذہین تھے، مطالعہ کے بے پناہ شوق نے زبان و ادب اور شعر و سخن کی طرف عنفوانِ شباب میں ہی مائل کر دیا تھا، قصبہ ہسوہ اور فتحپور شہر میں شعر و شاعری کا ماحول تھا۔

مولانا عارف ہسوی ایک راسخ العقیدہ کانگریسی تھے ان کے ذہن پر حضرت شیخ الہندؒ اور مفتی اعظم ہندؒ کے قوم پرست نظریات کا گہرا اثر تھا، وہ ہندو و مسلم، سکھ سب کو

ہندوستانی قوم مانتے تھے، ان کا ایقان تھا کہ ہندوستان کا ہر فرد خواہ مسلمان ہو یا ہندو مادر وطن کا فرزند ہے اور اس کی آغوش میں سب کو ایک ساتھ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا حق ہے، مولانا عارف ہسوی ایک سچے دیندار اور صوفیانہ خیالات کے آدمی تھے، لیکن سیاسی طور پر وہ کس درجہ کے کانگریسی تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب کانگریس کی طرف سے پنڈت موتی لعل نہرو کی رپورٹ سے مسلم رہنماؤں میں بے چینی پیدا ہوگئی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانیؒ جیسے مجاہدین آزادی کانگریس سے کبیدہ خاطر ہو گئے، مسلم لیگ کانگریس کے مقابلہ میں مسلمانانِ برصغیر کی سب سے بڑی پارٹی کی صورت اختیار کرنے لگی اس وقت بھی مولانا عارف ہسوی قوم پرست علماء اور سیاسی رہنماؤں کے ساتھ قائم رہے، وطن پرستوں پر کی جانے والی براداران اسلام کی سخت تنقید اور مخالفت بھی انھیں اپنے نظریات سے متزلزل نہ کرسکی کہ اتحاد کل مذاہب ہی آنے والے کل کے ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

دراصل عارف ہسوی جیل کے قیدیوں میں اپنی بزرگی، خوش خلقی اور دوسروں سے ہمدردی کی وجہ سے بے حد مقبول تھے، لوگ ان کی حق گوئی، پاکیزگی اور عبادت گزاری کو دیکھتے ہوئے انھیں دوسرے مفتی کفایت اللہ صاحب کی طرح مانتے تھے، مولانا عارف ہسوی کو روپئے پیسے کی ضرورت یا روزمرہ کی ضروریات مفتی کفایت اللہؒ سے بھی بہت کم تھیں، وہ ایک درویش خدامست کی طرح تھے، جب تک جیل میں رہے تو زندگی سرکاری خرچ پر گزرتی اور باہر آتے تو قلم کے مزدور بن جاتے، انھوں نے اپنی پوری زندگی تنگدستی اور افلاس میں گذاری لیکن ان کے رکھ رکھاؤ سے کبھی اس کا اظہار نہیں ہوا، انھوں نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، اور نہ معاوضے کے لیے سودے بازی، تکرار یا بحث کی، جو مل جاتا اسی میں قناعت کرتے، بظاہر وہ ہمیشہ ہشاش بشاش اور خوش وخرم نظر آتے تھے، اور بڑی مستی اور سرخوشی کے ساتھ تحریک آزادی کے کاموں اور لکھنے پڑھنے میں

مشغول رہتے، بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری:

بظاہر عارف ہسوی کی زندگی حسرت وغربت میں بسر ہوئی لیکن غور کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے مزاج اور ذوق وشوق کے مطابق نہایت کامیاب زندگی گزاری، وہ جہاں بھی جس حال میں رہے، خوش رہے۔

''اپنے عزم وارادہ اور سیاسی خیالات کی ترجمانی میں جری اور بیباک رہے، چنانچہ کچھ لوگ ان کے بعض اقدامات کو انتہا پسندی اور شدت کا نتیجہ تو کہہ سکتے ہیں لیکن ان کی نیت پر شبہ نہیں کر سکتے، وہ بلاشبہ اپنے دور کی ایک محترم اور اہم شخصیت تھے، اور زندگی کے ہر شعبہ میں لوگ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، کانگریس کے انتہا پسند گروپ کے تو وہ سر خیل تھے اور یہ بھی ان کی مخلصانہ قومی خدمت کا نتیجہ تھا کہ وہ کانگریس کے ایک معمولی رکن کی حیثیت سے شریک ہوکر دہلی کے صوبائی کمیٹی کانگریس کے صدر منصب تک پہنچے''۔

ملا واحدی اردو کے صاحب طرز ادیب تھے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''میرے زمانے کی دلی'' انھوں نے پاکستان جانے کے بعد لکھی جس میں اس دور کے نامور دلی والوں کا جذباتی انداز میں ذکر کیا ہے، مولانا عارف ہسوی چونکہ ان کے عزیز ترین دوستوں میں سے تھے، اس کا تذکرہ بڑی محبت سے کیا ہے، لیکن شاید وہ سیاسی قلمکار نہیں تھے، اس لیے عارف صاحب کے حوالے سے ان کے مختصر مندرجات سے ان کی سیاسی سرگرمیوں کا تفصیل سے پتہ نہیں چلتا پھر بھی جو کچھ انہوں نے لکھا اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ مولانا عارف ہسوی کس طرح کے انسان تھے، ملا واحدی لکھتے ہیں:

عارف صاحب نے دلی کے قیام کا بڑا زمانہ میرے مکان پر

گذارا، تقریباً سترہ، اٹھارہ سال وہ میرے مہمان رہے، آخر میں وہ پانچ چھ سال وہ مولوی عبدالحمید ایڈیٹر رسالہ ''مولوی'' کے یہاں رہنے گئے تھے، پان عارف صاحب کے کلے میں دبا رہتا تھا، پان کی کثرت سے ان کے کلے میں کینسر ہو گیا تھا، بہت علاج کیا لیکن کینسر کسے بخشتا ہے، میں ڈاکٹر جوشی کے ہسپتال میں عارف صاحب کو دیکھنے جاتا تو وہ مجھے بیماری کے زمانہ کا کلام دیدیا کرتے تھے، یہ بڑا عارفانہ کلام تھا، افسوس انقلاب ۱۹۴۷ء کی بھینٹ چڑھ گیا، ایک دن کہنے لگے، کانگریس سے مولانا محمد علی کے الگ ہو جانے سے مسلمانوں پر اتنا خراب اثر پڑا کہ وہ مجھ کو مسلمان نہیں سمجھتے، مگر میں آپ کو گواہ کرتا ہوں، کہ میں مسلمان مر رہا ہوں، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، عارف صاحب دلی صوبہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر تھے، ایک دفعہ میں مسٹر آصف علی کے ساتھ عیادت کے لیے گیا تو عارف صاحب کہنے لگے، واحدی صاحب ایک تمنا پوری کر دیجئے، آپ کے مکان کے جس کمرے میں دلی پہنچ کر پہلے دن بیٹھا تھا اس میں مرنا چاہتا ہوں میں اپنے یہاں لے آیا، مکان کے نیچے کی منزل انھیں دیدی، انھوں نے ہسوے سے اپنی والدہ اور بیوی وغیرہ کو بلالیا، عارف صاحب کے کیریکٹر کا ایک نمونہ تو وہ تھا کہ انھوں نے میرے رسالہ ''خطیب'' میں اپنے ضمیر کے خلاف اور معیار سے نیچے اتر کر لکھنا گوارہ نہ کیا۔

ان کی رائے صحیح ہو یا غلط مگر حقیقی اور مخلصانہ ضرور تھی، اوپری اور دکھاوے کی نہیں تھی، عارف ہسوی اپنی پوری جوانی جہاد آزادی کی نذر کر کے صرف پچاس سال کی عمر میں کینسر کا شکار ہوئے، علاج کے لیے پٹنہ کینسر ہسپتال لے جائے گئے، لیکن پھر دہلی میں علاج و معالجہ ہوا، بعد میں دہلی کے مشہور ڈاکٹر جوشی کے کلینک میں داخل رہے، جہاں ان کا

آپریشن ہوا، لیکن ساری کوششیں بے سود رہیں، ۱۲؍جنوری ۱۹۳۶ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے، شہر کے ہزاروں ہندو مسلمانوں نے جنازہ میں شرکت کی، مفتی اعظم ہندؒ (مفتی کفایت اللہ) نے نماز جنازہ پڑھائی، اور قبرستان دہلی گیٹ میں دفن ہوئے، مشہور ادیب احمد مرحوم نے مولانا عارف ہسوی کی قبر کے کتبے پر کندہ کرایا (ہمیشہ رہے اللہ کا نام)''۔

اس دنیا میں کوئی ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آتا، اپنی عمر کا وقفہ گزار کر سب کو جانا ہوتا ہے، مولانا عارف ہسوی بھی اللہ کی دی ہوئی عمر گزار کر چلے گئے، انھوں نے ملک کی آزادی کی لڑائی لڑتے ہوئے جس آزاد وطن کا خواب دیکھا ہوگا اپنی کانگریس پارٹی کی فتح یابی اور کامیابی کا جو تصور ان کے ذہن میں رہا ہوگا وہ حقیقت بن کر سامنے ہے، فی زمانہ جب ان کی جماعت نے طرح طرح کے اصلی نقلی مجاہدین آزادی کی یادگاریں قائم کی ہوئی ہیں، تو شاید آج کے کانگریسیوں کو ان کا نام بھی معلوم نہیں ہے، اور نہ ہی ہم اردو والوں کو اس کی توفیق ہوئی کہ اس عظیم فرزند وطن پر باقاعدہ تحقیق کر کے ایک کتاب ہی کے ذریعہ ان کی زندگی اور کارناموں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے، جو اس کی عظیم شخصیت پر احسان نہیں، خود ہماری اپنی آبرو بڑھانے کا باعث ہوتی۔ فقط تمت بالخیر (فخر وطن: ملخصاً ۳۵۱ تا ۳۶۱، مرتبہ: فاروق ارگلی صاحب، مطبوعہ فرید بکڈپو دہلی ۲۰۱۱ء)

○○○○

موہان کی تاریخی حیثیت

موہان کسی زمانہ میں ضلع اناؤ کی تحصیل تھی، لیکن آج کل اتر پردیش کا ایک پسماندہ قصبہ رہ گیا ہے، یہ لکھنؤ سے کانپور جانے والی قدیم شاہراہ پر واقع ہے، جہاں سے بسیں تو گزرتی ہیں، لیکن ریل سے موہان پہنچنے کے لیے ''اجگائیں'' (اجگین) ریلوے اسٹیشن پر اترنا پڑتا ہے، جو موہان سے بارہ میل کے فاصلے پر ہے، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بستی ''موہن'' نام کے ایک جوگی نے بسائی تھی، اس لیے اس کا نام موہان پڑ گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے امام موسیٰ کاظم کی اولاد میں سے ایک بزرگ سید محمد نیشاپوری نے آباد کیا تھا، جو سولہویں پشت میں حسرت کے جد امجد تھے، یہ بزرگ نیشاپور (ایران) کے قریب ایک مقام موہان میں پیدا ہوئے تھے، اور اپنے بیٹے سید منتخب کے ساتھ ۶۱۱ھ مطابق ۱۲۱۴-۱۲۱۵ء میں ترک وطن کیا اور مختلف مقامات پر ہوتے ہوئے التمش کے زمانے میں ۶۱۵ء مطابق ۱۲۱۸-۱۹ء کے دوران شہنشاہ التمش کے دور میں ہجرت کر کے ہندوستان آ گئے تھے، جہاں انھوں اپنی جائے سکونت کا نام بھی آبائی وطن کی یاد تازہ رکھنے کی غرض سے ''موہان'' ہی رکھا، یہیں انہوں نے ایک مقامی خاتون سے شادی کی، جن کے بطن سے ان کے دوسرے بیٹے سید جمال کی ولادت ہوئی اور آج کے سادات موہان میں سے بیشتر کا سلسلۂ نسب، انہیں سید جمال سے جا ملتا ہے، لیکن حسرت اور ان کے خاندان کا شجرہ سید منتخب سے تعلق رکھتا ہے، قدیم زمانہ میں موہان، باکمال حکیموں اور کاریگروں کی بستی کہلاتی تھی، اور سید جمال کی اولاد میں سے کئی افراد مختلف زمانوں میں شاہانِ اودھ کے جلیسوں میں شامل رہے، غالباً طب یونانی میں اہل موہان کی اسی مہارت کے پیش نظر اسے ''موہان خطۂ یونان'' کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے، موہان حضرت شاہ وجیہہ الدین محمد کی وجہ سے قرب و جوار میں

خاصا مشہور ہے، یہ بزرگ سید محمد نیشاپوری کی دسویں پشت میں گزرے ہیں۔(حسرت موہانی انگریزی، خالد حسین قادری ص:۳)

یہ حضرت سید حسن رسول نما دہلوی کے مرید اور اپنے دور کے ایک بڑے صوفی تھے، موہان میں ہر سال موصوف کی تاریخ وفات یعنی ۱۷ر شوال کو ان کا عرس منایا جاتا ہے، حسرت کے والد سید ازہر حسن، شاہ وجیہہ الدین محمد کی چھٹی پشت میں تھے(۱)، جن کا عقد سید نیاز حسن کی صاحبزادی شہر بانو سے ہوا تھا(۲)۔

❍❖❍

(۱) شاہ وجیہ الدین (۱۱۰۸ھ مطابق ۱۶۹۶ء) میں موہان میں پیدا ہوئے، ۱ر شوال ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۹ر جون ۱۷۹۱ء میں انتقال ہوا، گلابی باغ میں مدفون ہوئے، یہ مقام درگاہ رسول نما کہلاتا ہے، بقول حسرت ''دہلی کے مشہور بزرگ صوفی حضرت سید رسول نما دہلوی کے مرید تھے، سید رسول نما حضرت موسیٰ کاظم رضا کے خاندان سے تھے، ان کی ولادت بخارا میں ہوئی، والد کے ساتھ ہندوستان آئے، کچھ عرصہ موہان میں قیام کیا اور پھر دہلی آ گئے، یہیں گلابی باغ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، سید رسول نما کی وفات ۱۶۹۱ء میں ہوئی۔ (آثار الصنادید: سید احمد خان جلد سوم مرتبہ خلیق انجم دہلی ۱۹۹۰ء، ص:۳۲۳

(۲) حسرت موہانی: ص:۱۴/۱۵، مصنف: مظفر حنفی، مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، سن طباعت: ۱۹۸۹ء

سوانحی خاکہ مولانا حسرت موہانی

از مرتب

نام: فضل الحسن

تخلص: حسرت

پیدائش: قصبہ موہان ضلع اناؤ (یوپی)

تاریخ ولادت: ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء

ابتدائی تعلیم: قصبہ موہان میں مقامی مکتب کے مشہور میاں جی سید غلام علی کے پاس حاصل کی۔

فراغت تعلیم علی گڈھ: ۱۹۰۳ء

والد کا نام: سید ازہر حسن

مشہور اساتذہ: مولانا سید ظہور الحسن صاحبؒ بانی مدرسہ اسلامیہ فتح پور خلیفہ مولانا شاہ فضل رحمانؒ گنج مرادآبادی، مولانا نور محمد صاحب وغیرہ۔

تاریخ وفات: ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء

مقام وفات: فرنگی محل لکھنؤ

مدفن: فرنگی محل، آرام باغ لکھنؤ

❖❖❖❖❖

مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی بی، اے

ابتدائی اور طالب علمی کے حالات

وطن: آپ اور آپ کے اجداد سادات کرام میں سے ہیں۔ اصلی وطن نیشاپور تھا، ترک وطن کر کے مضافات لکھنؤ کو شرف اقامت بخشا، اس جگہ قصبہ موہان، ضلع اناؤ میں ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں مولانا حسرت کی ولادت واقع ہوئی، اس حساب سے اس وقت آپ کی عمر ۳۹ رسال کی ہے (۱)۔

علمی سفر اور آپ کے اساتذہ

ابتداءً حسبِ دستور قرآن مجید اور فارسی کی تحصیل مولوی غلام علی موہانی اور موہان کے مشہور میاں جی بلاقی (۲) سے گھر ہی پر کی، اس کے بعد اردو مڈل کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور تمام صوبہ میں ممتاز رہنے کے سبب وظیفہ حاصل کیا، اردو مڈل سے کامیابی کے ساتھ فراغت کر کے فتح پور ہسوہ چلے گئے، وہاں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہو کر انٹرنس کا امتحان، خاص امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور وظیفہ حاصل کیا (۳)۔

---

(۱) شفقت رضوی نے عارف ہنسوی رحم کی الہاشمی، گلشیر احمد قریشی اور اکرام الحسنی فاروقی کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ حسرت کا سنہ پیدائش ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء ہے۔

(۲) نام عبدالرحمٰن عرف میاں جی بلاقی موہانی۔

(۳) حسرت کی ابتدائی تعلیم موہان میں میاں جی غلام علی کے مکتب میں ہوئی، میاں جی غلام علی مولانا سید افقر موہانی کے دادا تھے اور ان کا مکتب اس زمانے میں قصبہ موہان میں بہت ممتاز اور مشہور تھا، اس وقت مکتب کی سطحی اور معمولی تعلیم بھی علاوہ دینیات کے سکندر نامہ، بہار دانش، اخلاق محسنی اور ادبی علمی کتابوں پر مشتمل تھی، مکتب کی تعلیم کے بعد حسرت موہان کے سرکاری مڈل اسکول میں داخل ہوئے، جہاں سے انھوں نے ۱۸۹۴ء میں اردو مڈل کا امتحان اس اعزاز کے ساتھ پاس کیا کہ؛ پورے صوبہ میں اول آئے۔ (حسرت موہانی / ۷، عبدالشکور، اشاعت سوم بحوالہ حسرت موہانی اور حیات و کارنامے ص: ۱۷، احمر لاری)

انگریزی تعلیم کے ساتھ ہی فارسی و عربی کی کتابیں بھی مولانا سید ظہور الاسلام صاحب (۲) بانئ مدرسہ اسلامیہ فتح پور اور مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم مدرس مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے پڑھیں، اس کے بعد عربی کی بقیہ کتابوں کی تحصیل مولانا خلیل احمد صاحب اسرائیلی سے کی،

غرضیکہ اسی طرح انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ محض اپنے شوق سے پرائیویٹ طور پر عربی و فارسی کی تعلیم کو بھی مکمل کرلیا۔

فتح پور میں مولانا کا زمانہ طالب علمی کے اعتبارات سے یادگار رہے گا، اول تو مولانا نور محمد، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب اور مولانا حبیب الدین صاحب جیسے برگزیدگان و مقدس حضرات کا فیض صحبت ایک ایسی نعمت عظمیٰ تھی، کہ پھر شاید ہی حسرت کو ایسی مقدس صحبت نصیب ہوئی ہو، اس کے علاوہ ان کے مخصوص احباب کی صحبت بھی نہایت پاکیزہ اور لطیف تھی، اس بزم رنگین کے بعض افراد ایسے تھے جن کی لطیف ہستیاں مولانا حسرت کے جذبات شعری کے لیے محرک بن گئیں، ان میں سے مولانا سید محمد ہاشم صاحب کے نام میں حسرت کے لیے بہت کشش وجاذبیت تھی۔

حسرت فطرتاً شاعر پیدا ہوئے (مرتب)

حسرت کی شاعری کی نشو ونما اور اس کی پرورش بھی فتح پور ہی میں ہوئی ہے۔ حسرت فطرتاً شاعر پیدا ہوئے، اور خدا نے ان کا دل ودماغ اس فن لطیف کے لیے کچھ اس قدر موزوں بنایا تھا کہ شروع سے ہی شاعری کے چشمے ابل پڑے، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ فتحپور ہی کے مقام نے آپ کو شاعر بنادیا، مگر اس میں کلام نہیں کہ طالب علمانہ مصروفیت کے ساتھ فتح پور میں ایسے محرکات لطیف کا اجتماع ہوگیا کہ حسرت کی فطری صلاحیت شعری کو اس سے تقویت پہنچی،

---

(۱) مولانا سید ظہور الحسن صاحب بانئ مدرسہ اسلامیہ فتح پور، یہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادیؒ کے اجل خلفاء میں ہیں، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "حیات ظہور" مصنف: قاری عبدالوحید صاحبؒ۔ مدرسہ اسلامیہ دراصل علی گڈھ کے طرز پر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے طرز پر ۱۸۸۳ء میں قائم کیا۔

اور آپ دل ببار دست بکار کی پُر لطف زندگی بسر کر سکے۔ چنانچہ آپ کی ابتدائی شاعری کا بیشتر حصہ فتح پور اور اس کے مضافات سے متعلق ہے، آپ اس قدر پر شور شاعرانہ طبیعت لے کر فتح پور آئے تھے کہ آپ کے تمام حلقۂ احباب میں اب تک اس کی پر لطف یاد باقی ہے۔

آپ نے فتح پور میں ایک کلب بھی قائم کیا تھا، مگر اس کے اغراض و مقاصد، متعارف کلبوں کے اغراض و مقاصد سے کوئی نسبت نہ رکھتے تھے، بلکہ وہ ایک رنگین صحبت تھی، جس میں حسرت کے مخصوص احباب شریک تھے، اور ان دلچسپ ولطیف مشاغل میں سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ شعر وسخن تھا۔

مولانا حسرت کی فطری صلاحیتِ شعری کا اندازہ، اس سے ہوسکتا ہے کہ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی نہایت عمدہ شعر کہنے لگے تھے، شاید بہت ہی کم شعراء ہوں گے، جنہوں نے اس قدر کم عمری میں ایسے پاکیزہ شعر نکالے ہوں۔ ہم یہاں پر فتح پور کی طالب علمی کے زمانہ کے چند اشعار نقل کرتے ہیں، اس سے آپ مولانا حسرت کی شعری استعداد وصلاحیت کا اندازہ کر سکتے ہیں (۱):

بارہا آتا ہے کس کا خیال ☆ بے خودی بتلا مجھے کیا ہو گیا
ناامید کا برا ہوا آخر ☆ اب نہیں دل میں تمنا کوئی

چشم جاناں کے ہیں دنیا سے نرالے انداز ☆ جب نظر کرتی ہے اک لطف نیا ہوتا ہے

ان اشعار میں جذبات کی پاکیزگی کے علاوہ روانی وسلاست بھی پائی جاتی ہے جو استادانہ پختگی کلام کی پیشین گوئی کر رہی ہے۔

بہر حال مولانا حسرت کا ابتدائی دور طالب علمی اپنے اندر ایسے آثار وعلائم رکھتا تھا، کہ ان کے آئندہ ترقی کرنے کی آسانی کے ساتھ پیشینگوئی کی جاسکتی تھی، حسرت کے احباب فتحپور

(۱) مولانا حسرت کے موہان کے سات دیوان جو مکمل ''کلیات حسرت'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، باذوق حضرات اور شعراء اس کتاب کا مکمل مطالعہ کر کے اپنے شعری سفر کا ذوق طے کر سکتے ہیں، مکمل تفصیل کے لیے ''حسرت موہانی: مصنف خلیق انجم'' ملاحظہ فرمائیں۔

کا بیان ہے کہ؛ ان کے کیریکٹر کی خوبیاں فتحپور ہی میں اچھی طرح نمایاں ہو چکی تھیں، اور اردو انگریزی کے ہر دو امتحانات میں ان کی اعلیٰ اور ممتاز کامیابی خود اس امر کی شاہد ہے کہ؛ وہ کس درجہ عملی زندگی کو محبوب و عزیز رکھتے تھے۔

فتحپور (۱) سے انٹرنس کا امتحان پاس کرنے اور وظیفہ حاصل کرنے کے بعد، یہ علیگڑھ چلے آئے اور کالج میں داخل ہو گئے، یہاں بھی آپ ممتاز طالب علموں میں شمار کیے جاتے تھے، اور کالج کی مشہور سوسائٹی یونین کلب میں اکثر آپ نے اردو انگریزی میں تقریریں کیں اور بعض مواقع پر قصائد اور نظمیں پڑھ کر سنائیں، جن کی نواب محسن الملک نے بارہا داد دی۔

آپ نے کالج میں ایک نئی انجمن قائم کی جس کے اغراض و مقاصد، شاید اردو لٹریچر اور اردو نظم و نثر کو ترقی دینا اور صحیح مذاق شعری کی ترویج و اشاعت تھی، آپ کو علمِ ادب سے ہمیشہ سے ذوق خاطر تھا، یہی وجہ ہے کہ زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی تھی، جو بالآخر کالج سے نکلنے کے بعد اردوئے معلیٰ جیسے وقیع رسالے کے اجراء کی صورت میں نکلا۔

(۱) ۱۸۹۹ء میں حسرت موہانی نے گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور سے انٹرنس کا امتحان درجہ اول سے پاس کیا۔ (حسرت موہانی ص: ۲۰ ہ مصنف: مظفر حنفی، مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۱۹۸۹ء)

دورِ ثانی اور قومی خدمات

آپ نے ۱۹۰۳ء میں کالج کی تعلیم سے فراغت حاصل کی اور بی، اے، کی ڈگری لے کر بجائے کسی دفتر میں کلرکی کرنے کے قومی خدمت گذاری کو اپنا واحد نصب العین بنایا، اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ نے ''اردوئے معلیٰ'' نکالا جو ادب و سیاست کے لیے اپنے وقت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا، یہ رسالہ ملک کے نامور رسالوں میں شمار ہوتا تھا اور بعض اوقات ملک کے مشہور اور قابل لوگوں کے مضامین بھی مشکل سے اس میں جگہ حاصل کر سکتے تھے، اس رسالہ نے چار پانچ برس تک نہایت وقیع اور اہم سیاسی و ادبی خدمات انجام دیں، اور آج جو غفلت شکن اور بیدار کن سیاسی روح مسلمانوں میں پائی جاتی ہے اس کا پہلا واعظ حسرت موہانی اور اس کا رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' تھا۔

مولانا حسرت کا ادبی و سیاسی مذاق، ابتدا ہی سے نہایت صحیح اور سلیم واقع ہوا تھا، چنانچہ شاعری میں وہ خاندانِ موہن کے متبع اور تسلیم تلمیذ نسیم دہلوی کے شاگرد ہیں، اور اس مذاق کی ''اردوئے معلیٰ'' کے ذریعہ آپ نے اشاعت کی، خاندانِ موہن کے اتباع سے مولانا حسرت کی شعری سلیم المذاقی کا اچھی طرح سے اندازہ ہوسکتا ہے، اسی طرح پالٹکس میں آپ مشہور وطن پرست خدائے ملک وقوم بال مسٹر گنگا دھر تلک اور بابو آر بندو گھوش کے مقلد و متبع ہیں، چنانچہ مسٹر تلک کے متعلق اپنی عقیدت کا ایک غزل میں اس طرح اظہار فرمایا ہے:

اے تلک اے افتخار جذبۂ حب وطن — حق شناس و حق پسند و حق یقیں و حق سخن
تجھے قائم ہے بنا آزادیٔ بیباک کی — تجھے روشن اہل اخلاص وصفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزند ہند — خدمت ہندوستان میں کلفت قید محن

ذات تیری رہنمائے راہ آزادی ہوئی　　تھے گرفتار غلامی ورنہ یارانِ وطن
تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں　　یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسم کہن
ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو　　اے تجھے قائم رکھے تا دیر رب ذوالمنن (۱)

اس لحاظ سے حسرت کے ہر دو مذاق ادبی وسیاسی نہایت صحیح واقع ہوئے ہیں اور اسی کے مطابق وہ اردوئے معلیٰ کو ترتیب دے کر ملک وقوم کے سامنے پیش کرتے تھے، بہر حال: ''اردوئے معلیٰ'' پہلا اسلامی رسالہ تھا، جس نے ملک میں صحیح سیاسی روح پھونکی، اور چہل سالہ ہندوؤں کی مخالفت اور حکومت کی بیجا خوشامد وتملق کی پالیسی کے خلاف جہاد شروع کیا، مگر یہ وہ زمانہ تھا، جبکہ قدامت پسندی اور استبداد پرستی کا دیو تمام اسلامی ہند پر مسلط تھا، اور کانگریس کی ہم سفیری اور اس کی موافقت میں آواز بلند کرنا کفر سے کم نہ سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اسلامی سیاسی حلقہ میں ''اردوئے معلیٰ'' کو کبھی بار نہیں ملا اور نہ مولانا حسرت کی آواز اس کو کچھ زیادہ متاثر کر سکی، بلکہ؛ بسا اوقات سخت وشدید مخالفت کی گئی، اردوئے معلیٰ کو گمراہ کن اور مولانا حسرت کو ''دیوانہ ملاّ'' کا خطاب دیا گیا، اس مخالفت میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو آج حریت وآزادی کے سالار قافلہ کہلاتے ہیں، اور فی الواقع اب وہ اس معزز خطاب کے مستحق بھی ہیں، مثلاً: مسٹر شوکت علی، حسرت کو ''دیوانہ ملا'' کہا کرتے تھے، اور مولانا ابو الکلام ان کے ایک ہم خیال دوست سید حیدر رضا صاحب دہلوی کو ''سودیشی قلی'' کے خطاب سے یاد کیا کرتے تھے، لیکن یہ حسرت کا اعجاز صداقت ہے کہ آج وہی لوگ حسرت کے بہترین ہم خیال اور ان کے سچے اور پاکباز دوست ہیں اور جس مشن کی تبلیغ حسرت کر رہے تھے، اس کے مکمل کرنے میں یہ حضرات سب سے زیادہ ساعی ہیں۔

❖❖❖❖

(۱) دیوان حسرت حصہ اول مشمولہ کلیات حسرت موہانی ص:۱۶۸

حسرت کی سیاسی مشغولی

بقول بیگم: صاحبہ حسرت موہانی، زمانہ طالب علمی ہی سے مولانا حسرت کو سیاسی تحریک کے ساتھ خاص دلچسپی اور ہمدردی تھی، چنانچہ بی، اے، کی ڈگری حاصل کرنے کے دوسرے ہی سال مئی ۱۹۰۴ء میں وہ بمبئی کانگریس میں بحیثیت ڈیلیگیٹ شریک ہوئے، اور سورت کانگریس تک (۱۹۰۷ء) برابر شریک ہوتے رہے، اور بمبئی کلکتہ، بنارس کانگریس کی اردو رپورٹیں بھی کتابی صورت میں بطور ضمیمہ ''اردوئے معلیٰ'' (۱) میں شائع کیں، لیکن سورت کے معرکۃ الآراء اجلاس کانگریس سے مسٹر تلک کے ساتھ ہی حسرت بھی علاحدہ ہوگئے، اور اسی طرح کانگریس سے نفرت کرنے لگے جس طرح آغا خانی لیگ سے اپنے سیاسی عقائد کی بنا پر کرتے تھے، لیکن لکھنؤ کے اجلاس مسلم لیگ کے بعد سے حسرت لیگ میں بھی شریک ہونے لگے، کیونکہ لکھنؤ کے اجلاس میں مسلم لیگ کے نصب العین میں جمہور امت کے سیاسی عقائد کے مطابق اصلاح ہوگئی تھی، اور آئندہ اصلاح کی توقع قائم ہو چلی تھی، چنانچہ اس وقت سے آپ لیگ کے تمام اجلاسوں میں برابر شریک ہوتے رہے، اور حق وصداقت کی ترجمانی میں کبھی آپ نے غفلت وکوتاہی نہیں کی، حالانکہ ایسے مواقع آئے جن میں بڑے بڑے مدعیان حریت کے پاؤں صراط مستقیم سے ڈگمگا گئے، مگر حسرت کے پائے عزم وثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی، چنانچہ؛ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آگرہ میں جب آغا خان نے مسجد مقدس کانپور کے فیصلہ کے متعلق لارڈ ہارڈنگ کے شکریہ کا ریزولیشن پیش کیا تو مستبدین کے علاوہ اکثر احرار نے اس کی تائید کی، لیکن مولانا حسرت اور مولوی عبدالودود بریلوی نے نہایت پرزور طریقے سے اس سے اختلاف کیا اور آخر وقت تک اس رائے پر قائم رہے کہ موجودہ صورت حال جمہور مسلمانوں کی اس قابل نہیں کہ اس پر شکر وامتنان کا ریزولیشن پاس کیا جائے۔

(۱) انھوں نے ''اردوئے معلیٰ'' میں بمبئی ۱۹۰۴ء، بنارس ۱۹۰۵ء اور کلکتہ ۱۹۰۶ء کانگریس کی رپورٹیں بھی بطور ضمیمہ شائع کیں۔ (مقالہ حسرت موہانی اردو ادب حسرت نمبر ۸۱، مجنوں گورکھپوری)

اسی طرح بمبئی کے اجلاس مسلم لیگ میں بھی آپ باوجود لوگوں کی دراندازیوں کے اظہار حق واعلان صداقت سے باز نہیں رہے حتی کہ؛ بعد میں مستبدین کی طرف سے اجلاس مسلم لیگ کو درہم برہم اور منتشر کر دینے کی جو کوشش کی گئی چونکہ؛ یہ کوشش آپ کے اختلافی ریزولیشن کے ساتھ ہی شروع کر دی گئی تھی، اس لیے اکثر حلقوں میں اس افساد وتفسید کا الزام مولانا حسرت ہی پر عائد کر دیا گیا۔

غرضیکہ حسرت کی پرخلوص زندگی جرأت وصداقت کے محیر العقول کارناموں سے معمور ہے، وہ شدید ترین موانع ومشکلات کے مواقع پر بھی اظہار حق سے کبھی باز نہیں رہے، ان کی پالیسی بالکل صاف اور غیر پیچیدہ ہے، اور جس سختی کے ساتھ اپنے سیاسی معتقدات کی حفاظت کرتے ہیں اور سخت وشدید مصائب وآلام اور خوفناک خطرات کے مقابلے میں جس بے پروائی کے ساتھ وہ اب تک اپنی پالیسی پر قائم ہیں اس کی نظیر پولیٹیکل رہنماؤں میں بہت کم مل سکتی ہے۔

دورِ ابتلاء و آزمائش کا آغاز

خداوند قدوس کی یہ ایک سنت جاریہ ہے کہ وہ اپنے عزیز ومحبوب بندوں کو ابتلاء و آزمائش میں ڈالتا اور اس کے ذریعہ مراتب و درجات میں بلندی عطا فرماتا ہے اور اگر اس امتحان و آزمائش میں وہ پورا اترتا ہے تو پھر وہ قادر قیوم اس بندہ پر کامیابی کی راہیں کھول دیتا ہے، اور اس کی بے سروسامانی وتنہائی کے اندر اس قدر سامانِ فتح وقوت پیدا کر دیتا ہے کہ پھر کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مولانا حسرت کے لیے بھی ان مراحل سے گزرنا اور ابتلاء و آزمائش کی اس کسوٹی پر کسا جانا ضروری تھا، خدا تعالیٰ کو ان کے خلوص وصداقت کا امتحان لینا منظور تھا، اور اس کے ذریعہ ان کی برداشت مصائب کی قوت اس قدر ترقی عطا فرمانا منظور تھا کہ آئندہ باطل کی کوئی سخت سے سخت قوت بھی ان کے پرخلوص کاروبار میں حارج نہ ہو سکے، چنانچہ عملاً میدانِ عشق میں قدم رکھے ہوئے چار ہی سال گذرے تھے کہ امتحان کی پرخطر وادیاں راستہ میں آنا شروع ہو گئیں، وہ سخت گیریاں جو پردۂ خفا میں مستور رہ کر وقتاً فوقتاً دامن گیر ہوتی رہیں، ان کے علاوہ ۱۹۰۸ء میں لطف ستم اور لذت ایذا کی کھلی ہوئی دعوت آپ کو دی گئی یعنی آپ پر اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون (مصر میں انگریزوں کی پالیسی) شائع کرنے کے جرم میں بغاوت کا مقدمہ دائر کر دیا گیا اور جیسا کہ اس قسم کے مقدمات کا حشر ہوا کرتا ہے اسی کے مطابق اس کا فیصلہ یہی کیا گیا یعنی آپ کو دو برس کی قید سخت کی سزا دی گئی۔

یہ مضمون جس کی وجہ سے آپ کو قید فرنگ کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں درحقیقت علی گڈھ کالج کے ایک طالب علم کا لکھا ہوا تھا، مگر حسرت کے اعلیٰ کیریکٹر اور ان کے اعلیٰ اخلاق اور خوبیوں کا اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مضمون نگار کا

نام نہیں لیا، اور خود اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لی (۱)۔

حسرت کی بلند حوصلگی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے ان کے خلاف شہادت دی تھی ان کو ان لوگوں سے کبھی کسی قسم کی پرخاش نہیں ہوئی اس کے مقابلے میں نواب وقار الملک کے علاوہ اب تک علی گڈھ کے جاہ پسند اصحاب حسرت سے بلا وجہ بغض و عناد رکھتے ہیں اور عملاً مضرت رسانی کی فکر میں رہتے ہیں، لیکن حسرت نے اب تک ان حالات و واقعات کو کبھی پبلک طور پر ظاہر نہیں کیا۔

بہر حال! اس مقدمہ میں آپ کو سزا ہوگئی، اور مصائب و آلام کا ایک ایسا دور شروع ہوا، جس نے حسرت کی روحانی و ایمانی قوتوں میں بے شمار اضافہ کر دیا، یہ مصائب و آلام معمولی نہ تھے، حسرت کے ساتھ جیل میں جو سختیاں کی گئیں، وہ ظلم و بے انصافی کی عبرتناک مثالیں ہیں، اور جب محکوم ہندوستان کی تاریخ لکھی جائے گی، تو حسرت پر جس قدر ظلم توڑے گئے ہیں اور ان پر جس قدر جور و ستم کی بارش کی گئی ہے، وہ اس تاریخ کا سب سے زیادہ تاریک اور سیاہ باب ہوگا۔

سب سے پہلی اور سب سے زیادہ سخت ناانصافی جو حسرت کے ساتھ کی گئی وہ یہ تھی کہ ان میں اور اخلاقی مجرموں میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، اور نہ صرف یہ بلکہ تمام مجرمین سے بھی زیادہ ذلت انگیز اور تکلیف دہ برتاؤ ان کے ساتھ کیا گیا یہاں تک کہ قواعد جیل کے مطابق جن رعایتوں سے عام قیدی مستفید ہوتے رہتے ہیں حسرت کو ان سے بھی ہمیشہ محروم رکھا گیا، مثلاً یہ کہ کسی قیدی سے چکی پیسنے کی سخت ترین مشقت دس پندرہ روز سے زیادہ نہیں لی جاتی مگر حسرت کی تمام میعادِ قید اسی مشقت میں گذار دی، اور جب تک جیل میں رہے

(۱) یہی وہ زمانہ ہے یعنی ۱۹۰۸ء جب حسرت نے ''اردوئے معلیٰ'' اپریل ۱۹۰۸ء میں ایک مقالہ چھاپا، جس کا عنوان تھا ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'' اس مقالے پر مصنف کی حیثیت سے ''راقم: ایک طالب علم از علی گڈھ'' دیا گیا۔ (مولانا حسرت موہانی ایک سیاسی ڈائری ص: ۳۸)

چکی ہی پیستے رہے، یہاں تک کہ پورا رمضان المبارک اس صبر آزما شغل میں بسر ہوا، پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے علاوہ حکامِ جیل کی طرف سے دوسری قسم کی سخت گیریاں بھی عمل میں آتی رہیں، مثلاً کسی کو اجازت نہ تھی کہ وہ حسرت سے گفتگو کرے یا ملازمانِ جیل میں سے کوئی شخص مولانا کے ساتھ جائز رعایت بھی نہیں کرسکتا تھا۔

آغازِ قید کا حال (مرتب)

خود مولانا حسرت نے اپنے رسالہ اردوئے معلیٰ میں آغاز قید کا حال اس طرح لکھا ہے:

۴/اگست ۱۹۰۸ء سے قید سخت کا آغاز اس طرح ہوا کہ کچہری سے جیل واپس پہنچتے ہی ایک لنگوٹ ایک جانگیا اور ایک کرتہ ٹوپی پہننے کو اور ایک ٹکڑا ٹاٹ کا اور کمبل اوڑھنے بچھانے کے واسطے اور ایک قدح آہنی بڑا اور چھوٹا، دیگر جملہ ضروریات کو رفع کرنے کی غرض سے مرحمت ہوا، ان چند چیزوں کے سوا، قیدیوں کو اور کوئی شئ پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی، ابتداء میں سامانِ بودوماندگی کی اس تقلیل سے کسی قدر تکلیف ضرور محسوس ہوئی لیکن؛ بہت جلد طبیعت نے انہی کے استعمال پر قانع ہوکر ایک عجیب وغریب سبق حاصل کیا کہ اگر انسان ہوا و ہوس کو ترک کردے۔ تو زندگی کی ضرورتیں اس قدر کم ہیں اور وہ اتنی آسانی کے ساتھ فراہم ہوسکتی ہیں، کہ بظاہر ان کے لیے انسان کو جبر وستم یا مکر وفریب کے وسائل اختیار کرنے اور بعض اوقات اغیار کی بندگی وغلامی تک کے قبول کرنے پر آمادہ ہوجانا ایک حیرت انگیز معاملہ نظر آتا ہے۔

زندانی معاشرت کی یہ فقیرانہ شان، ہر طرح سے، راقمِ حروف کے مناسب حال تھی البتہ ابتداء میں بحالت نیم برہنگی فریضہ نماز کے ادا

کرنے میں تکلیف ہوتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ اپنی مجبوری و بے بسی کے احساس نے اس کا بھی خوگر بنا دیا، جیل کی سخت ترین مشقت چکی سے پہلے ہی روز سابقہ پڑا اور راقم نے بمصداق ''بر سر اولاد آدم ہر چہ آند بگذرد'' اس جبری خدمت کو بسر و چشم قبول کیا۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں، کہ لوگوں کا عام طور پر خیال تھا کہ یہ مشقت چند روزہ ثابت ہوگی اور کسی سینٹر جیل میں تبدیل ہونے پر کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے گا۔

چنانچہ دفعتاً ۱۳ر اگست کو تبادلہ کی خبر معلوم ہوئی، تو لوگوں کے اس گمان کو اس بنا پر تقویت حاصل ہوئی کہ اس جیل میں گورنمنٹ برانچ پریس اور جیل پریس کی موجودگی میں کوئی لکھنے پڑھنے کا کام لیا جائے گا لیکن؛ راقم کو اہل فرنگ کی شرافت اور عالی حوصلگی سے اس رعایت کی توقع نہ تھی، چنانچہ بعد میں میرا خیال صحیح نکلا اور وہاں بھی چکی کی پر اذیت و ذلت انگیز مشقت سے سابقہ پڑا، اور تقریباً ساری مدت روزانہ ایک من آٹا پیسنے سے سروکار رہا، حالانکہ عام قیدیوں سے بھی عموماً چکی ایک ماہ سے زیادہ نہیں پسوائی جاتی۔

نینی جیل (مرتب)

علی گڈھ سے الٰہ آباد جیل کی روانگی اور وہاں پہنچنے پر جن تکالیف کا سامنا ہوا، اس کی نسبت ''مشاہدات زندانِ فرنگ'' کے تحت میں مولانا تحریر فرماتے ہیں: کہ گورنمنٹ نے کرایہ کے علاوہ دوسری ضروریات کے لیے ایک پیسہ زائد نہیں دیا(۱) یہاں تک کہ راستہ میں قیدیوں کی خوراک کے لیے ار روپیہ فی کس روز کے حساب سے ملتا ہے، وہ بھی نہیں ملا، جس کا نتیجہ

(۱) بطور یادداشت مشاہدات زنداں۔

یہ ہوا کہ؛ دوسرے دن صبح تک تھوڑے سے بھنے ہوئے چنوں کے سوا کچھ کھانے کو نہ ملا۔

الٰہ آباد جیل میں داخل ہونے کے بعد علی گڈھ جیل کے کپڑے اتروا لیے گئے اور کہا گیا کہ؛ یہاں کے کپڑے کچھ دیر میں ملیں گے، اس وقت تک کالے کپڑے پہنو، جن کی کیفیت یہ تھی کہ؛ ان سے زیادہ کثیف وغلیظ اور بودار کپڑوں کا تصور بآسانی ذہن میں نہیں آسکتا، لیکن مجبوراً وہی کپڑے پہننے پڑے، عینک بھی اتروالی گئی، حالانکہ علی گڈھ میں معائنہ کے بعد اجازت مل گئی تھی (اور چونکہ مولانا کی نگاہ دور بین نہیں ہے اس لیے بغیر عینک کے وہ بالکل معطل سے ہو گئے) تھوڑی دیر کے بعد جیلر صاحب نازل ہوئے، اور میرے ساتھ کے تمام اخباروں، کتابوں اور کاغذوں کو باستثنائے دیوانِ حافظ جلوا کر خاکستر کر دیا، اور دفتر میں حاضر ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

دفتر میں مجھ کو غضب آلود اور قہر بار نگاہوں سے دیکھ کر ارشاد ہوا: کہ اگر یہاں ٹھیک طور سے نہ رہو گے، تو بیمار بنا کر اسپتال بھیجے جاؤ گے، اور وہاں مار کر خاک کر دیئے جاؤ گے۔

اس کے علاوہ ان دفعداروں کو جو قیدیوں سے کام لیتے ہیں حکم ملا تھا کہ ان کے دماغ کی گرمی نکال دو، اس کا منشاء یہ تھا کہ بلاوجہ مولانا کو اذیت پہنچائی جائے۔

بہر حال: اس پرستار حریت وفدائے ملک وقوم نے ان مصائب وتکالیف کو ہنسی خوشی برداشت کر لیا اور کبھی ایک لمحہ کے لیے کمزوری کو اپنے پاس تک نہ آنے دیا، بلکہ ستمگاریوں سے امر حق کی خدمت گذاری کا ولولہ اور زیادہ نشو پذیر ہوا اور ایسی قوت حاصل کر لی کہ برسوں کی ریاضات ومجاہدات سے بھی یہ بات حاصل نہ ہوتی۔

یہ بھی خداوند ارض وسماء کا ایک احسان عظیم تھا کہ اس نے مسکین حسرت کو پہلے تو مبتلائے آلام کیا، پھر خود ہی اس کی برداشت کی قوت عطا فرمائی، اس کے علاوہ دیگر اخلاق حسنہ اور صفات حمیدہ کی طرف بھی اس قید فرنگ کے ذریعہ رہنمائی کی، چنانچہ عزم واستقلال کے علاوہ یہ سبق بھی مولانا کو حاصل ہوا کہ ''آنچہ مادر کار داریم اکثرے در کار نیست'' چنانچہ

اب مولانا بالکل فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ وہ سامانِ معاش کی تلاش میں دیوانہ وار اور حریصانہ طریق سے اراذل امور اور ذمائم اخلاق کے جال میں نہیں پھنسے، اور ہر وقت ان سے جدا ہو جانے کے لیے تیار ہیں، یعنی انھوں نے اپنی ضروریات وتعلقات کو اس قدر مختصر ومحدود کر لیا ہے کہ وہ آئندہ درد ومصائب سے گھبراتے نہیں، اور ان سے علاحدہ ہو جانے کے خوف سے حق وصداقت کے نشر واعلان سے باز نہیں رہتے، جیسا کہ ملک وقوم کو بارہا تجربہ ہو چکا ہے، اور اب اس تجربہ کی تجدید ہو رہی ہے۔

مختصر یہ کہ: اس پر آلام ومحن زمانہ قید کو مولانا نے صبر وشکر کے ساتھ، حکیم شیراز کے اس شعر کو زبانِ حال سے پڑھتے ہوئے ختم کر دیا۔

پنداشت ستم گر کہ جفا بر ما کرد ☆ بر گردنِ او بماند و بر ما بگذشت

ترجمہ: ستم گر نے جانا کہ اس نے ظلم ہم پر کیا ہے، ہمارے اوپر گذر گیا اور اس کی گردن پر (ہمیشہ کے لیے) باقی رہا

برکات السجن (یعنی قید فرنگ کی روحانی برکتیں) (مرتب)

دیار صدق واقلیم صداقت کا یہ ایک مسلم مسئلہ ہے کہ باطل کے جبر وتسلط میں بھی حق کی سربلندی کی قوت مخفی ہوتی ہے اور ظلم وعدوان کی راہیں بھی آخر میں دیار حق کے صراط مستقیم سے جا ملتی ہیں، یعنی انسان کی مادی طاقت اپنی قہرمانیوں کے اندر جادۂ صداقت کے لیے ایک نور مستور رکھتی ہے اور وہی نور مستور بالآخر ظلمت استبداد کی چادر کو چاک کر کے سیہ خانۂ ظلم وطغیان کو منور کر دیتا ہے، غرضیکہ ابتلاء وآزمائش کا دور آخر ین حق وصداقت کے لیے بے شمار فوائد وبرکات اور لاتعد ولاتحصی منافع ومفاد کا واحد ذریعہ ہوا کرتا ہے، پھر اس کلیہ سے مولانا حسرت کی ذات گرامی کیونکر مستثنیٰ رہتی اور یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے کاروبار کی نصرت بخشی کے لیے خداوند قدوس کا دستِ اعانت فرما حسرت کی طرف نہ بڑھتا۔

یقیناً اس کو جنبش ہوئی اور اس نے حسرت کو اپنی پناہ میں لے لیا، پھر اب وہ کون سی قوت ہے جو حسرت پر فتح پا سکے، اور کون سی طاقت ہے، جو حسرت کی قوتِ ایمانی کو زیر کر سکے، یہی ایک فضل و تائید ربانی برکات السجن کے تحت میں کیا کم ہے کہ؛ کسی دوسری چیز کی تلاش میں آپ نکلیں، حالانکہ اس کے علاوہ قید فرنگ کی سختیوں نے حسرت کے دامن کو روحانی فیوض سے مالا مال کر دیا، اس کو بھی نظر انداز کیجئے، برکات السجن کے صرف اس حصہ کو لیجئے جس کا تعلق براہ راست ملک و قوم سے ہے۔

دنیا کی تاریخ حریت و استبداد کا بغور مطالعہ کیجئے، آپ کو ایسے نفوس قدسی کی مثالیں بکثرت ملیں گی، جو قید کی پر محن زندگی میں بھی قومی خیال سے غافل نہیں رہے، اور وہاں بھی سلسلۂ رشد و ہدایت اور خدمت فرمائی کو انہوں نے جاری رکھا، حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت امام احمد بن حنبل، حضرت علامہ ابن تیمیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ان کے علاوہ موجودہ عہد میں بلا قید مذہب وملت مقتدائے وطن پرستان مسٹر بال گنگا دھر تلک، حسرت کی طرح، یہ تمام حضرات اپنے عہد میں حمایت حق و پرستاری صدق کے جرم میں، بے جرمی میں مقدس بیڑیاں اپنے پیروں میں پہن چکے ہیں، اور جیل کی صعوبات میں گرفتار ہو چکے ہیں، مگر ان بلا کُشاں (۱) صداقت نے اُن پُر اَذِیَّت لمحات میں قوم کو فراموش نہیں کیا اور جس قدر ممکن ہو سکا خدمت کرتے رہے، یعنی اگر زبان بند کر دی گئی تو قلم کو انہوں نے نہیں چھوڑا اور جس حد تک اس کو آزادی دی گئی انھوں نے اس سے کام لیا۔

بعض بزرگوں کے حالات تو اس قسم کے موجود ہیں کہ ان کے مقدس وجود نے جیل خانہ کو بھی خانقاہ، دار الحدیث اور موعظت خانہ بنا دیا اور ہزاروں بد اخلاق قوموں کو چند ہی روز میں متخلق باخلاق اللہ انسانوں کی صورت میں تبدیل کر دیا۔

(۱) مصیبتوں اور مشکلات کو کھولنے والا۔

اکثروں نے تالیفات وتصنیفات کا شغل جاری رکھ کر موتیوں میں تولنے کی قابل پُر ازحکمت وموعظت مصنفات قوم کے لیے تیار کردیں، لیکن حسرت کے مقدس جسم کی طرح ان کا قلم بھی مجبور ومحبوس تھا، اور سخت تاکید تھی کہ کاغذ قلم دوات کیا، کاغذ کا ردی ٹکڑا بھی ان تک نہ پہنچ جائے، لیکن بایں ہمہ؛ اس نے رمضان المبارک میں روزے رکھ رکھ کر اور چکی پیس پیس کر ایک عدیم النظیر دیوان تیار کردیا، اور اس طرح اردو لٹریچر میں ایک قیمتی اضافہ ہوا، اس دیوان کی شعری لطافت وپاکیزگی جو قیمت رکھتی ہے، حق یہ کہ وہ انمول ہے؛ لیکن اس کے علاوہ مولانا حسرت نے پردۂ شعر میں جابجا حریت ووطن پرست کا درس دیا ہے اور حق کی طرف انھوں نے اس ذریعہ سے رہنمائی کی ہے۔

یہی وہ چیزیں ایسی ہیں کہ؛ دوسروں کی آزادی سے زیادہ قیمتی ہیں مگر ان کے علاوہ بھی مولانا نے ایک خدمت ملک وقوم کی کی ہے، یعنی ''مُشاہداتِ زندان فرنگ'' کے عنوان سے موصوف نے ایک طویل سلسلہ جیل خانوں کی وہ بدانتظامیاں اور ابتریاں بیان کی ہیں، جن کو سن کر انسانیت کی روح لرز جاتی ہے اور اس امر کا صحیح اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس عہد تہذیب میں دور ظلمت ووحشت کی یاد کو کس طرح زندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تمام متمدن ممالک میں جیل خانوں کا انتظام نہایت عمدہ ہوتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ مجرموں کے اخلاق درست ہوجائیں نیز کوئی وحشیانہ برتاؤ ان کے ساتھ نہیں کیا جاتا لیکن ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ کے انتظامات جیل حسب تحریر مولانا حسرت موہانی اس قدر ابتر وبدتر ہیں کہ اصلاح ودرستی کے عوض مجرمین کے اخلاق اور زیادہ ذلیل ومبتذل ہو جاتے ہیں اور خلاف انسانیت وتہذیب وجو سختیاں روا رکھی جاتی ہیں ان کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے، مولانا حسرت نے انتظامات جیل پر نہایت تفصیلی ناقدانہ نظر ڈال کر اہل ملک کو اس سے آگاہ کیا اور کونسل کے آنریبل ممبروں کو توجہ دلائی چنانچہ آنریبل بابو گنگا پرشاد

صاحب ورما آنجہانی نے صوبجات متحدہ کی کونسل میں ایک سوال کے ذریعہ گورنمنٹ کو اس حالت زار کی طرف توجہ دلائی، اگر چہ حکومت نے نہایت متمردانہ اور معروضانہ انداز میں اس سوال کو ٹھکرا دیا تاہم اہل ملک اس حقیقت سے کم از کم آگاہ ہو گئے، حکومت کی بے نیازی واستغنا کو شکست دے کر اپنے مطالبات کو تسلیم کرالینا تنہا حسرت کا نہیں بلکہ تمام ملک وقوم کا کام ہے۔

آنریبل موصوف آنجہانی نے دریافت کیا تھا، کہ ''آیا گورنمنٹ کی نظر سے اردوئے معلیٰ کے یہ مضامین گذرے ہیں اور آیا ان کی بابت کچھ تحقیقات کی جائے گی''، لیکن اس سوال کا جواب انسپکٹر جنرل صاحب نے کمال تمردو بے پروائی سے یہ دیا کہ ''گورنمنٹ کے نزدیک ان مضامین کی کوئی وقعت نہیں ہے اور ان کے متعلق نہ کوئی تحقیقات کی گئی ہے اور نہ آئندہ کی جائے گی'' یہ جواب جن پُرغرور الفاظ اور جس غضب ناک لہجہ میں دیا گیا ہے اس سے اس امر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ غریب حسرت پر جیل میں کیا کچھ ستم نہ توڑے گئے ہوں گے، اور یہ کہ حکومت کو مولانا حسرت سے کس درجہ عناد ہے اس جواب کے متعلق مولانا حسرت اپنے رسالہ اردوئے معلیٰ کے نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''خیر آپ حاکم ہیں ہم لوگ محکوم جو چاہے کیجئے لیکن اتنا خیال رہے کہ جبر وخودسری کے ساتھ غرور اور تمردوزوال کی یقینی علامت ہے''۔ ''سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ''(۱)۔

ابتداء حسرت کو مجسٹریٹ علی گڈھ نے دوسال قید سخت اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا اپنے تمام اختیارات سے کام لے کر دی تھی، جرمانہ کے وصول کرنے میں اس سزا کی نوعیت میں وہ اور اضافہ کر سکتے تھے، چنانچہ علی حوصلہ مجسٹریٹ نے زر جرمانہ وصول کرنے کے حیلہ سے حسرت کا نہایت نادر وقیمتی کتب خانہ برباد کر ڈالا، یہ کتب خانہ تقریباً چار ہزار روپیہ کا تھا، اور اس میں نہایت نادر ونایاب قلمی کتابیں تھیں ایسا قیمتی اور لاجواب کتب خانہ صرف

(۱) ترجمہ: اور عنقریب ظالم جان لیں گے کہ وہ کیسی جگہ پلٹ کر جاتے ہیں۔ (الشعراء: ۲۲۷)

ساٹھ روپیہ میں برباد کر دیا گیا ظاہر ہے، کہ اس حرکت سے مولانا حسرت کو جس قدر تکلیف ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ صرف اہل علم و ذوق ہی کر سکتے ہیں۔ مولانا نے اس زیادتی کے متعلق جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

> اس جرمانہ کی بدولت کتب خانہ اردوئے معلیٰ کی جو حالت ہوئی، اُس کا بیان نہایت دردناک ہے، جن کتابوں کو راقم حروف نے معلوم نہیں، کن کن کوششوں اور دقتوں سے بہم پہنچایا تھا، جن کتابوں میں بہت سے ایسے نایاب اور قلمی نسخے و دواوین شعراء وغیرہ کے تھے، جن کی نقل بھی کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی، ان سب کو پولیس کے جاہل جوان تھیلوں میں بھر بھر کر اس طرح سے بھر لے گئے، کہ جیسے لوگ لکڑی اور بھنس لے جاتے ہیں، اس کے بعد ان کتابوں پر کیا گذری اس کا ذکر کرتے ہوئے ہمارا دل دکھتا ہے، اس لیے اس سے قطع نظر ہی مناسب ہے، اس جبر و ظلم کا انصاف خدا کے ہاتھ ہے" (۱)۔

بہر حال؛ مجسٹریٹ صاحب علی گڈھ کے اختیار میں جس قدر تھا انھوں نے حسرت کو اذیت دینے اور ان کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا؛ لیکن ان کی تجویز کردہ دو برس کی میعاد میں ہائی کورٹ سے ایک سال کی تخفیف ہوگئی، اور چونکہ حسرت کی مالی حالت نہایت سقیم تھی کیونکہ؛ وہ ایک فقیرانہ زندگی بسر کر رہے تھے، اس لیے زر جرمانہ کے عوض چھ ماہ قید سخت کی اس میں اضافہ ہو کر ڈیڑھ سال کی مدت میں قید رہ گئی، اس قدر طویل مدت بھی حسرت پر سختیاں کرنے کے لیے کچھ کم نہ تھی، چنانچہ حکام جیل نے حسرت کو تکلیف پہنچانے اور ان پر غیر معمولی سختیاں کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، پورے دس مہینہ تک برابر روزانہ ایک من گیہوں مولانا کو پیسنے پڑے اور اگر مولانا پورے ڈیڑھ برس تک جیل میں

(۱) حسرت موہانی قید فرنگ میں ص: ۹۹-۱۰۰ بحوالہ حسرت موہانی ص: ۲۱۲، خلیق انجم۔

رہتے تو باقی میعاد بھی اسی محنت میں کاٹنی پڑتی، مگر مولانا کے والد بزرگوار کے انتقال کی وجہ سے حسرت کے بڑے بھائی سید روح الحسن صاحب وکیل حیدر آباد دکن نے زر جرمانہ مجبوراً ادا کر دیا، کیونکہ اگر ایسا نہ کرتے تو وراثتاً جو قلیل جائیداد حسرت کو ترکہ میں ملی تھی، اس کو بھی مجسٹریٹ علی گڈھ نیلام کر ڈالتے اور جس طرح کتب خانہ برباد کر دیا گیا تھا، اسی طرح جائیداد کو بھی مفت تباہ کر ڈالتے، اس طرح پر گویا چھ مہینے کی مدت اور گھٹ گئی، اور صرف ایک سال آپ جیل میں رہے۔ اور اس تمام مدت میں آپ کو چکی ہی کی سخت مشقت سے سابقہ رہا۔ یہ داستانِ درد جو ایک پرستار حق و حامی صداقت کو اہل استبداد و ارباب اقتدار کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑی۔

ابتلاء و آزمائش کے بعد

مولانا حسرت نے اس امتحان خداوندی میں ثابت قدم رہ کر یہ ثابت کر دیا کہ اہل ایمان دنیا کی کسی طاقت سے کبھی کسی حالت میں مرعوب نہیں ہو سکتے، اور ان کا سر نیاز سوائے خداوند قدوس کے آستانہ عز و جلال کے کسی دوسرے دروازہ پر کبھی نہیں جھک سکتا، ان کو مصائب و آلام کے طوفان اپنی جگہ سے ایک انچ ادھر ادھر نہیں کر سکتے، ان کے ناتواں جسم اور ان کی کمزور ہستیاں پہاڑوں سے زیادہ وزنی ہوتی ہیں، جن کو ضلالت و گمراہی کی قہار موجیں جنبش تک نہیں دے سکتیں، چنانچہ مولانا حسرت نے یہ تمام مصائب و آلام برداشت کر کے اور پھر اپنے معتقدات پر اس سختی کے ساتھ قائم رہ کر ثابت کر دیا کہ حق کی قوت کبھی مغلوب نہیں ہو سکتی، اور صداقت کی لازوال طاقت کسی کے فنا کرنے سے فنا اور کسی کے نیست و نابود اور برباد کرنے سے برباد نہیں ہو سکتی، بلکہ جس طرح گیند کو پٹک کر اور سیلاب کو روک کر اس کی قوت میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اسی طرح حق کو دبانے سے اس کی طاقت اور بھی زیادہ قوت حاصل کر لیتی ہے، مولانا حسرت کا حال اس حقیقت کے بالکل

مطابق ثابت ہوا، وہ قید فرنگ سے آزاد ہونے اور مصائب وآلام برداشت کرنے کے بعد اور زیادہ جری و بیباک اور اپنے عزائم وافکار میں اور زیادہ راسخ وثابت قدم ہو گئے۔

چنانچہ قید فرنگ سے آزادی حاصل ہونے کے بعد حسرت کے بعد کمزور طبیعت احباب نے لکھا کہ اب آپ اپنی روش بدل لیجئے تاکہ آئندہ مصائب سے محفوظ رہیں، مگر حسرت نے جن الفاظ میں احباب کے ان مشوروں کا جواب دیا ہے اس کو پڑھ کر روح میں بالیدگی اور قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

مولانا حسرت کی پالیسی

اردوئے معلیٰ کی دوبارہ اشاعت پر چند احباب نے بمقتضائے محبت وہمدردی یہ صلاح دی ہے کہ ہم کو اب پالٹیکس سے بالکل دست کش ہو جانا چاہیے، بعض کا مشورہ یہ تھا کہ اگر سیاسی مضامین ہوں بھی تو مسلم لیگ کی مسلمہ پالیسی کے موافق ہوں، چند دوستوں نے جو یقیناً زیادہ آزاد خیال ہیں یہاں تک اجازت دی کہ اگر جمہور اہل ہند ہی کی ہم خیالی منظور ہو تو کانگریس کے نرم رفیق کی روش اختیار کی جائے۔

ہم پر ان تمام نیک نیت مشوروں اور مصلحت کوش صلاحوں کا شکریہ فرض ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے خیال میں یقین یا عقیدہ عام اس سے کہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی ایک ایسی چیز ہے جس کو خوف یا مصلحت کے خیال سے ترک یا تبدیل کر دینا اخلاقی گناہوں میں سے ایک بدترین گناہ ہے جس کے ارتکاب کا کسی حریت پسند یا آزاد خیال اخبار نویس کے دل میں ارادہ بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔

پالٹیکس میں ہم مقتدائے وطن پرستان مسٹر تلک اور سرگروہ احرار بابو آریندو گھوش کی پیروی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں، چنانچہ اس حیثیت سے فیروز شاہی کانگریس سے ہم کو اتنی ہی بیزاری ہے جتنی امیری مسلم لیگ یا نوزائیدہ لال چندی کانفرنس سے اور ہمارے خیال میں

یہ بیزاری بالکل حق بجانب ہے، اس لیے کہ دنیا کی رفتار اور اہل دنیا کے طبائع کا میلان صریحاً حریت کی جانب ہے۔

چنانچہ خوابیدہ براعظم ایشیا میں بھی ہندوستان کے سوا اور کوئی بڑا ملک اس وقت آزادی کی نعمت سے محروم نہیں ہے، پس عقل سلیم کسی طرح باور نہیں کرسکتی کہ تمام عالم میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک باقی رہے جس کی قسمت میں محکومی دوام کی ذلت لکھ دی گئی ہو، ایسا گمان بظاہر مشیت ایزدی کے سراسر خلاف نظر آتا ہے۔

غرضیکہ ارباب دانش وبینش کو یہ بات ماننی پڑے گی کہ؛ فرنگی حکومت کا غیر طبعی نظام ہمیشہ کے لیے ہندوستان میں باقی نہیں رہ سکتا، اور اپنی موجودہ صورت میں تو اس کا چند سال قائم رہنا بھی دشوار نظر آتا ہے۔

گرم رفیق کے رہنما عموماً اور بابو آریندر گھوش خصوصاً تمام پولیٹیکل کوششوں میں مذکورۂ بالا اصول کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس واسطے ہمارے نزدیک وہ حق پر ہیں۔

برخلاف اس کے رہنمایان فریق نرم، پیروان مسلم لیگ اور بانیان کانفرنس ہندو، اہل ہند اور دوامی محکومی کو لازم وملزوم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ان حضرات کے نزدیک ہمارے انتہائی عروج کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ: ہم غلام سے ترقی یافتہ غلام یا محکوم سے خوشحال محکوم ہو جائیں۔

یہ لوگ آزادی ہند کی خواہش کو خواب وخیال سے زیادہ وقعت نہیں دیتے، ان کا دائرۂ خیال اور اس لیے دائرۂ عمل بھی نہایت تنگ اور محدود ہے، ان کی روش دنیا کی رفتار حریت کے خلاف اور اس لیے قطعی طور سے غیر طبعی اور ناقابل قبول ہے۔

اردوئے معلیٰ کو ان لوگوں کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ بقول مرحوم مصطفیٰ کمال پاشا "مفتوح قوموں اور ملکوں کے لیے اس کے سوا اور کوئی پالیسی نہیں ہوسکتی، کہ وہ

اپنی تمام محنت کے ساتھ حریت کامل کے دوبارہ حاصل کرنے کی سعی میں مصروف ہوجائیں''

اور مزید کہا: ''پس جس شخص کی پالیسی اس سے کچھ بھی مختلف ہو اس کی نسبت سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بھی خواہان وطن کے گروہ سے یقیناً خارج ہے''

یہ ہے وہ پالیسی جس کا اظہار شدائد وقید برداشت کرنے اور اس سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مولانا حسرت موہانی نے کیا، اس بیان سے مولانا کی بلند خیالی، حوصلہ مندی اور بیباک جرأت وعلوہمت کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے، انھیں خیالات ومعتقدات کے مطابق جیل خانے سے قبل بھی ان کا عمل تھا اور وہاں سے آنے کے بعد بھی ہمیشہ انھیں پر عمل رہا اور اب تک اس پالیسی پر کاربند رفرما ہیں۔

اس سے ان کے عزم واستقلال، ثبات ارادہ اور استقامت فی الرائے پر کافی روشنی پڑتی ہے، کہ مولانا حسرت کس کیریکٹر کے بزرگ ہیں اور انھوں نے قومی فلاح وبہبود کی خاطر اپنے تئیں کس قدر مہالک وخطرات میں ڈالا اور کس حد تک انھوں نے مصائب و نوائب کے علاوہ نقصانات برداشت کیے۔

یہ اپنی تحریر سے بالکل واقعہ ہے کہ مولانا حسرت اگر چاہتے تو دنیاوی ثروت وجاہ اور دولت وعزت کے حصول میں اپنے کسی معاصر سے پیچھے نہ رہ سکتے تھے، خدا نے ان کو ہر طرح کی قابلیت عطا فرمائی تھی، دل ودماغ اور زبان وقلم سب ہی کچھ ان کے پاس موجود تھا، اس پر مستزاد یہ کہ ضروریات اسی کی مقتضی تھیں، اس کے علاوہ ان کو معلوم تھا کہ آج کل ہر دولت مند کس قدر آسانی سے قوم کا لیڈر بن جاتا ہے، یہ امور ایسے تھے کہ ایک بندہ ہوا و ہوس کے لیے انکا اختیار کرنا امر ناگزیر تھا، لیکن اس قدر محرکات قویہ کے باوجود انھوں نے ان میں سے کسی ایک بات کی طرف بھی کبھی توجہ نہیں کی، نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ قومی خدمت گذاری کا ولولہ صرف یہی ایک دولت تھی، جو خدا نے ان کو عطا فرمائی تھی، اور اس پر وہ قانع تھے، اور اس کے مقابلہ میں کائنات کی۔

حسرت کا عزم واستقلال اور ایثار وفدویت

ہر قیمتی سے قیمتی چیز کی طرف سے انھوں نے اپنی چشم قناعت پسند کو بند کرلیا، ہوس جاہ اور طلب نام ونمود کے مکروہ جذبات سے حسرت کا قلب پاک کبھی آشنا نہیں ہوا، ان کا باطن خود ان کے اور دوسروں کے ظاہر سے زیادہ پاک وصاف ہے، صدق وصفا زہد وورع کے اوصاف، ان میں قدماء کی طرح جلوہ گر ہیں، نئی پود میں شاید ہی ایسی مثالیں مل سکیں، جن میں مزاج کی سادگی کے ساتھ، حوصلہ کی بلندی، یقین کی استواری، حق پسندی وحق شعاری، خلوص وتقویٰ اور ایثار وفدویت کے اعلیٰ اوصاف وکریمانہ اخلاق، حسرت سے زائد یا حسرت کی برابر پائے جاتے ہوں، ان کے ایثار کامل کا ثبوت، اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ؛ باوجود ہر قسم کی قابلیتوں کے اور بیشمار گردوپیش کے خارجی واندرونی ترغیبوں کے انھوں نے وجاہت طلبی کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کرلیں، اور قومی خدمت گذاری کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے کر اپنی معاشرتی دنیا کو قانعانہ اور متوکلانہ طریق پر نہایت محدود ومختصر کرلیا، اور چونکہ انھوں نے اپنی ضروریات کو بہت محدود کرلیا ہے، اس لیے مدنیت کے غیر ضروری لوازمات کے لیے وہ کسی دوسرے کے محتاج نہیں ہوتے، اور اس استغناء و بے نیازی کا اثر ان کے قوت ضمیر وجرأت وصداقت اور بے باکانہ اظہار رائے پر پڑتا ہے، یعنی کوئی خارجی طاقت ان کو متاثر ومرعوب کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

حسرت کے ایثار کا صحیح اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کی آمدنی ابتداء سے اس وقت تک کبھی شاید پچاس روپیہ سے زائد نہیں ہوئی، سودیشی اسٹور قائم کرنے سے پہلے تو اردوئے معلیٰ کی محدود آمدنی پر مولانا قانع تھے اور اردوئے معلیٰ کی اشاعت پانچ سو سے کبھی زائد نہیں ہوئی، جن لوگوں کو اخباری تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اس قدر محدود اشاعت میں کس قدر آمدنی ہوسکتی ہے، بس یہی ایک آمدنی تھی جس پر حسرت اپنے اہل وعیال کے

ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، جیل جانے کے بعد اردوئے معلیٰ بند ہو گیا اور یہ تھوڑی بہت آمدنی بھی جاتی رہی، اس وقت خدا ہی کو معلوم ہے کہ بیگم صاحبہ حسرت موہانی اور ان کی شیر خوار بچی نے کیونکر دن گذارے۔

اس کے علاوہ نہایت قیمتی کتب خانہ تلف کر دیا گیا، اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کے دوسری قلیل آبائی جائیداد سے ادا کرنا پڑا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد ان کے پاس معاش کا کوئی سامان نہ تھا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حسرت کے سایہ سے لوگ بھاگتے تھے، ان کے ساتھ ہمدردی کرنا اور ان کو کسی قسم کی امداد بہم پہنچانا تو ایک بڑی بات تھی، اکثر لوگ ان کو پالیٹکس سے باز رہنے کی فہمائش کرتے تھے، اکثر کمزور طبائع نے ان سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا، غرضیکہ ملک وقوم کی طرف سے ان کے ایثار و فدویت کی کوئی قدر دانی نہیں کی گئی بلکہ ان کی روش کی ہمیشہ تضحیک کی گئی، اور ان کو ہندوؤں کا غلام اور مسلمانوں کا نادان دوست کہا گیا لیکن باوجود ان باتوں کے اس مرد حق نے کبھی اپنے عزائم و آراء سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹایا اور حق پرستی کی جو روش ابتداء سے انھوں نے اپنے لیے منتخب کر لی تھی اس پر نہایت سختی سے ہمیشہ قائم رہے، اس پالیسی کی وجہ سے حسرت ہمیشہ مخفی وعلانیہ صعوبات میں مبتلا ہوتے رہے، لوگوں نے ان کی فقیرانہ زندگی کو بھی رواداری کے ساتھ نہیں دیکھا، اور اس عالم فقر میں بھی طرح طرح کی مشکلات ان کے راستہ میں حائل کرتے رہے، چنانچہ قید فرنگ سے آزادی ملنے کے بعد علی گڈھ کالج کے طلباء کو ان سے ملنے کے لیے روک دیا گیا، یہاں تک بھی کوئی مضائقہ نہ تھا مگر بغض وعناد کی دوسری منزل دنائت اخلاق کی نہایت ذلیل مثال ہے یعنی جب سے مولانا حسرت نے سودیشی اسٹور قائم کیا تو اور زیادہ قدغن کر دیا گیا کہ ہرگز کوئی طالب علم نہ حسرت سے ملے نہ ان کے اسٹور سے کوئی چیز خریدے، یہاں تک کہ کسی دوسرے ذریعہ سے بھی ان کے یہاں سے کوئی چیز نہ منگوائی جائے۔

اگر ارکانِ کالج حسرت کی زہریلی صحبت سے طلباء کالج کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور مسلمہ چالیس سالہ عہد وفا کو اس صورت میں قائم رکھنا مقصود تھا، تو یہ چنداں حرج کی بات نہ تھی، اس لیے کہ ہر شخص کو اپنی پالیسی پر نیک نیتی کے ساتھ عمل کرنے کا حق حاصل ہے لیکن اپنے مخالف عقائد ہستی کو نقصان پہنچانا، کسی قوم کا قانونِ اخلاق جائز نہیں رکھتا، ظاہر ہے کہ علی گڈھ میں اہل تجارت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کالج ہے، خصوصاً کپڑے، موزے، ٹوپیاں، بنیان، تولیے اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی نکاسی جس قدر تنہا کالج میں ہوتی ہے، شاید تمام شہر علی گڈھ میں نہ ہوتی ہوگی اور حسرت کے خلاف ارکانِ کالج کا ایسا طرز عمل اختیار کرنا کہ؛ طلباء اپنے ملازمین اور دیگر ذرائع سے بھی حسرت کی دوکان سے خرید وفروخت نہ کرا سکیں، صریح ظلم وزیادتی ہے مگر؛ حسرت نے پبلک طور پر کبھی ان باتوں کا اظہار نہیں کیا، اور ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ ان مشکلات کو برداشت کرتے رہے، ارباب استبداد کے اس طرز عمل سے حسرت کو جس قدر نقصان پہنچا ہوگا، وہ ظاہر ہے، حسرت کے بعض احباب نے اس حالت کو دیکھ کر مشورتاً، ان سے عرض کیا کہ آپ علی گڈھ چھوڑ دیں تو اچھا ہے کیونکہ علی گڈھ کے قیام میں بجز نقصان کے کوئی فائدہ نہیں ہے، مگر حسرت نے اس کو منظور نہیں کیا، اور اس کو کمزوری پر محمول کر کے اس سے انکار کر دیا اور برابر نقصان برداشت کرتے رہے۔

بہر حال جیل سے آنے کے بعد حسرت نے پھر دوبارہ اردوئے معلیٰ کو جاری کیا(۱)، مگر چونکہ اب کوئی سرمایہ ان کے پاس باقی نہیں رہا تھا، اور حکومت کے لطف ومہربانی نے ان کی مالی حالت اس قابل نہیں رہنے دی تھی کہ وہ اردوئے معلیٰ کو پھر اسی سابقہ شان سے نکال سکتے، اس لیے مجبوراً ان کو اردوئے معلیٰ کا سائز حجم اور اسی کے ساتھ اس کی قیمت کم کرنی پڑی یعنی صرف ایک روپیہ قیمت رکھی، ابتداء میں تو ساڑھے سات سو خریدار ہو گئے مگر بعد میں اکثر لوگوں نے کمزوری طبیعت کے باعث خریداری ترک کر دی، چنانچہ تھوڑے دنوں کے بعد پھر

(۱) انھوں نے دوبارہ ''اردوئے معلیٰ'' کو ۱۹۰۹ء میں پھر نکالنا شروع کیا۔ (حسرت موہانی حیات اور کارنامے ص:۸۹)

وہی پانچ سو اشاعت رہ گئی، گویا سال بھر میں صرف پانچ سو روپیہ حسرت کے ہاتھ میں آنے تھے جس میں سے خود اردوئے معلیٰ کے سال بھر کے مصارف میں شامل تھے، اگر ان مصارف کو منہا کر کے خالص آمدنی حسرت کی دیکھی جاتی تو شاید دس بارہ روپیہ ماہوار سے کسی طرح سے زائد نہیں ہو سکتی مگر اس حالت میں بھی حسرت خوش رہے نہ کبھی کسی سے امداد و اعانت کے خواستگار ہوئے اور نہ قوم و ملک ہی کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی ان کی کی گئی۔

کیا اس دور حرص و ہوا اور اس عہد زور دریا میں ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، کہ اس قدر مصائب و مشکلات کے باوجود، وہ اپنے کسی ایسے عقیدہ پر قائم رہے ہوں، جن میں ان کا کوئی ذاتی مفاد متعلق و وابستہ نہ ہو، ہم یہ نہیں کہتے؛ کہ ایسی مثالیں موجود ہی نہیں ہیں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ مسلمانوں میں بہت ہی کم ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ خصوصاً آج سے پانچ سات برس قبل تو کم از کم ظاہری اسٹیج پر حسرت کے ایثار و فدویت کی کوئی مثال موجود نہ تھی۔

یہ ایسے حالات ہیں اور ابتلاء و آزمائش کا وہ نازک دور ہے جہاں بڑے بڑے مدعیان عزم و ثبات کے قدم صراط مستقیم سے ڈگمگا جاتے ہیں مگر کوہِ وقار اور گرامی قدر حسرت کا پائے عزم و ثبات جس جگہ پہلے دن تھا آخیر وقت تک وہیں جما رہا، اور مشکلات کا کوئی طوفان اور ملاقات کا کوئی دباؤ اس کو اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکا۔

سودیشی تحریک اور حسرت

مولانا حسرت سودیشی تحریک کے ابتداء ہی سے حامی و مؤید تھے، اور ہمیشہ اس تحریک کو وسعت و فروغ دینے میں ساعی و خواہشمند رہے۔ وہ سودیشی تحریک کو ہندوستان کی اقتصادی ترقی کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں، ایسی حالت میں ناممکن تھا کہ اس قدر مفید و سودمند تحریک کو کامیاب بنانے میں ان کا دست عمل حرکت نہ کرتا۔

دنیا جانتی ہے کہ؛ حسرت کا وجود ایک پیکر عمل ہے، ان کے مذہب میں عقیدہ کا تعلق، صرف قلب ہی سے نہیں ہے؛ بلکہ وہ اس کو ایک مرئی شکل میں دیکھنا پسند کرتے ہیں، چنانچہ اس تحریک کے متعلق بھی ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ؛ جس قدر ممکن ہو، اس کی وسعت تمام ہندوستان کو اپنی آغوش میں لے لے، اس میدان میں سب سے پہلا قدم، ان کا خود اپنے نفس اور اپنے متعلقین کی طرف بڑھا، یعنی: سب سے پہلے انہوں نے خود اپنے اور اپنے متعلقین کے اوپر غیر ملکی مصنوعات کو حرام کر لیا، اس کے بعد اس تحریک کو وسعت دینے میں مصروف ہو گئے، چنانچہ آپ کی سعی و کوشش سے کم از کم اسلامی حلقہ میں اس تحریک کو بہت کچھ ہر دلعزیزی حاصل ہوئی، بہت سے لوگوں پر صرف آپ کی مخلصانہ عملی زندگی کا اثر پڑا، بہت سے لوگ آپ کے وعظ و نصیحت اور تقریر و تحریر سے متاثر ہوئے، اور اس تحریک کو کامیاب بنانے میں عملاً شریک ہو گئے، ایسے لوگوں کی تعداد تو بہت ہے جنھوں نے کم از کم خود ملکی مصنوعات کو استعمال کرنا اور غیر ملکی مصنوعات پر اس کو ترجیح دینا شروع کر دیا۔

لیکن حسرت کی عملی زندگی یہاں پر آ کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ انھوں نے اس تحریک کو زیادہ وسیع پیمانہ پر کامیاب بنانے کی تدابیر اختیار کیں، یعنی انھوں نے کوشش کر کے ایک سو دیشی اسٹور قائم کر دیا، اس میں روزمرہ کی تمام ضروریات، انھوں نے فراہم کر لیں۔

حسرت نے یہ سودیشی اسٹور کچھ اپنے ذاتی سرمایہ سے نہیں کھولا تھا، یعنی ان کے پاس اس قدر سرمایہ کبھی تھا ہی نہیں، کہ وہ اوسط پیمانہ پر بھی کوئی دوکان جاری کر سکتے، بلکہ وہ مولانا شبلی و نواب وقار الملک کی وساطت سے سر فاضل بھائی کریم بھائی سے ملے اور مولانا کی سفارش سے سر فاضل بھائی سے قرض کپڑا خریدا، اسی طرح دوسری چیزیں دوسرے تھوک فروشوں سے قرض خریدیں، اس شرط پر کہ فروخت کر کے ادا کر دیں گے، اور پھر خریدیں گے، سر فاضل بھائی کے نام نواب وقار الملک بہادر مرحوم نے بھی ایک سفارشی تحریر حسرت کو لکھ دی تھی۔

غرضیکہ ان کوششوں سے آپ نے سودیشی اسٹور کھول دیا اور رفتہ رفتہ تمام ضروریات کی چیزیں اس میں مہیا کرلیں، چونکہ حسرت کی طبیعت سراپا استقلال ہے اس لیے اس کام کو بھی اس قدر مستقل مزاجی اور محنت کے ساتھ آپ نے انجام دیا کہ یہ دوکان چل نکلی اور خاصی کامیابی اس میں حاصل ہوئی، شوربازتھوک فروشوں کا قرض ادا کیا اور ان سے مال منگوالیا۔

چنانچہ حسرت کی اس تجارتی سرگرمی کو دیکھ کر مذاقاً مولانا شبلی مرحوم نے فرمایا تھا کہ ''تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے پھر پالیٹیشن بنے اور بنئے ہوگئے'' (۱) شاید آپ خیال کرتے ہوں گے کہ حسرت کا جوش عمل اب اس منزل پر ضرور ختم ہوگیا ہوگا، یقین کیجئے کہ حسرت کی نسبت ایسا خیال کرنا ان کے ولولۂ عمل وجذبۂ صادق کی توہین کرنی ہے، حسرت کی مساعی یہیں تک محدود نہیں رہیں، بلکہ انھوں نے اس تحریک کو مزید وسعت دینے کے لیے اکثر مقامات کے دورے کیے اور وہاں جاجا کر اس تحریک کی خوبیاں لوگوں کے ذہن نشیں کرائیں اور تجارتی نفع کا یقین دلا کر بہت سے قصبات اور شہروں میں سودیشی دوکانیں کھلوادیں جو اب تک کامیابی کے ساتھ چل رہی ہیں۔

غرضیکہ حسرت ملک کی اقتصادی حالت کے درست کرنے میں بھی بالکل اسی طرح سرگرمی سے ساعی رہے جس طرح وہ میدانِ سیاست میں سرگرم کار تھے، اور ان کا یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء سے جاری ہے یعنی انڈسٹریل کانفرس میں وہ ۱۹۰۵ء سے شریک ہیں، بیگم صاحبہ حسرت موہانی فرماتی ہیں کہ حسرت کا قطعی ارادہ ہے کہ وہ اس صوبہ کے ہر ضلع میں سودیشی اسٹور قائم کرکے رہیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

❖❖❖❖

(۱) حسرت کی سیاسی زندگی، مقالہ سید سلیمان ندوی مشمولہ نگار حسرت نمبر ص:۱۱۳

تعلیمی تحریک اور حسرت کی مساعی

مولانا حسرت کی نسبت عام طور پر لوگوں کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ؛ وہ ایک اچھے شاعر اور انتہاء پسند پالیٹیشن ہیں، لیکن صرف سیاست و ادب کے اندر ان کے مساعی زندگی کو محدود کر دینا ان کی دیگر خدمات جلیلہ کی حق تلفی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصلاح ملک کی تمام تحریکوں سے ان کا تعلق ہے، البتہ بعض کے ساتھ خصوصیت اور لگاؤ ہے، بعض کے ساتھ کم، تاہم تعلیمی تحریک ایک ایسی چیز نہیں کہ حسرت اس کو پوری اہمیت نہ دیتے ہوں، ان کو مسلمانوں کی تعلیمی تحریک سے بھی اسی درجہ کا اعتنا ہے، جس قدر سیاست وغیرہ سے، چنانچہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ میں ان کی مساعی و انہماک سے سارا ملک واقف ہے، اس سلسلے میں انھوں نے قوم کی بیش بہا خدمات انجام دیں ہیں، اور عام جذبات کے احترام کرنے پر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کو انھوں نے بارہا مجبور کیا ہے۔

حسرت کا خیال ہے کہ اس وقت جمہور اسلام کو ثانوی تعلیم کی سخت ضرورت ہے، تاکہ عام طور پر مسلمان صنعت وحرفت اور تجارت وزراعت وغیرہ میں شریک ہوسکیں، اس خیال کی بنا پر وہ اسکولوں کے قیام، کالجوں سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، اور اس خیال کی بنا پر وہ اسکولوں کے الحاق کے بغیر مسلم یونیورسٹی کو مفید نہیں سمجھتے، چنانچہ حسرت نے آخر وقت تک اس امر کی کوشش کی کہ جب تک آزاد یونیورسٹی نہ ملے، اس وقت گورنمنٹ کے محدود وغیر آزادی بخش چارٹر کو قبول نہ کیا جائے، حسرت جس خیال کی بنا پر اس امر کے ساعی رہے وہ تنہا انہیں کا خیال نہ تھا بلکہ؛ فی الحقیقت وہ جمہور کی ترجمانی کر رہے تھے، کیونکہ جمہور ملت کے خیالات ومطالبات بھی یہی تھے، کہ جب تک آزاد یونیورسٹی نہ ملے اس وقت تک وہ غیر مفید ہے اور اس لیے ایسی یونیورسٹی قبول نہ کرنی چاہیے۔

جس وقت تک مسٹر محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نظر بند نہیں ہوئے، اس وقت تک یونیورسٹی کے متعلق حسرت کی جد وجہد زیادہ وسیع نہ تھی کیونکہ؛ یہ دونوں کام کرنے والے بزرگ موجود نہ تھے، تاہم مقامی حیثیت سے کبھی غافل نہیں رہے، اور ان مجالس میں جو مسئلہ مذکور کے متعلق وقتاً فوقتاً منعقد ہوتی رہیں، ہمیشہ پورے جوش واعتماد کے ساتھ اس میں شریک ہوئے، اور اس امر کی کوشش کی کہ عام اسلامی جذبات کو پامال نہ ہونے دیا جائے، لیکن جب سے مولانا ابوالکلام اور مسٹر محمد علی نظر بند ہوئے، اس وقت سے مولانا حسرت نے اپنی جد وجہد کی رفتار کو زیادہ سریع وتیز کر دیا اور نہایت سرگرمی کے ساتھ اس بات کی کوشش میں مصروف ہو گئے کہ کوئی ایسا فیصلہ نہ کیا جائے جو عام رائے کے خلاف ہو۔

چنانچہ جب لکھنؤ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ طلب کیا گیا اور مولانا نے دیکھا کہ؛ عام رائے اور جماعت احرار کو کوئی سپورٹ کرنے والا نہیں، تو مولانا نے اس غرض کو پورا کرنے کی خاطر ایک وسیع دورہ کیا اور اس سفر میں کثرت سے لوگوں کو فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کے لیے آمادہ کیا، چنانچہ مولانا حسرت کی اس جد وجہد اور سعی وکوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ احرار کو شکست فاش ملنے سے رہ گئی، حالانکہ افواہاً مشہور تھا کہ؛ اس مرتبہ میدان صاف ہے لہٰذا پالا (جیت) ارباب استبداد کے ہاتھ رہے گا، مگر الحمدللہ کہ جب تک حسرت آزاد رہے، اس وقت تک اس کا کوئی موقع ارباب حل وعقد کو نہیں ملا، اگرچہ اس کے بعد جب ابوالکلام محمد علی اور حسرت جیسے مقتدایان ملت نہ رہے تو پانسہ پلٹ دیا گیا۔

بہر حال حسرت کا تعلیمی شوق وانہماک بھی دوسرے مشاغل سے کم نہ تھا، مولانا حسرت اپنے اس خیال کے مطابق کہ مسلمانوں کو ثانوی تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے یہ مصمم ارادہ کیے ہوئے ہیں کہ؛ ان شاء اللہ ہر ضلع اور قصبہ میں وہ ایک اسلامی درسگاہ قائم کرا کے رہیں گے، خدا ہم چنیں کند

ہمت بلند دار کہ نزد خدا وخلق ☆ باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

معاشرتی امور میں بیگم صاحبہ حسرت موہانی تحریر فرماتی ہیں: کہ حسرت کو اصلاح تمدن کے تمام مسائل سے اتفاق کامل ہے، البتہ رسم پردہ کے متعلق ان کا عقیدہ اور عمل دونوں رواج کے خلاف ہیں، حسرت ہندوستان کے موجودہ اور مروجہ طرز کے پردہ کو کوئی مذہبی فرض نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک چہرہ اور ہاتھ داخل ستر نہیں اس لیے ان کا چھپانا بھی مذہباً لازمی نہیں ہے، تاہم اہل ہند کی اخلاقی حالت کے لحاظ سے وہ جمہور ملت کے لیے رسماً و مصلحتاً نہ کہ مذہباً پردہ کو جائز سمجھتے ہیں البتہ خواص کے لیے جن کو کسی قسم کے فساد کا اندیشہ نہ ہو وہ پردے کو بیکار سمجھتے ہیں اور اپنے اس خیال پر عمل بھی کرتے ہیں جیسا کہ ان کے سب مخلص دوستوں کو معلوم ہے اس موضوع پر ایک مدلل مضمون شائع کرنے کا قصد بھی ہے، جس کی نسبت ان کا خیال ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد سخت سے سخت حامی پردہ بھی اپنے قدیم عقیدے پر قائم نہ رہ سکے گا۔

خیر یہ موقعہ اس بحث کا نہیں ہے مگر چونکہ بیگم صاحبہ حسرت موہانی نے تاکیداً تحریر فرمایا ہے کہ حسرت کے اس عقیدہ کا اظہار ضرور کر دیا جائے اس لیے یہ چند سطریں لکھی گئیں۔

مولانا حسرت کا مذہب و مشرب

مولانا حسرت موہانی جس طرح اپنے سیاسی عقائد میں نہایت متحکم اور مضبوط ہیں اسی طرح مذہبی اعمال و عقائد میں بھی کمال درجہ شغف و توغل رکھتے ہیں، اور اپنے کلام میں جا بجا اپنے ہر قسم کے معتقدات کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

مذہباً مولانا حنفی ہیں اور مشرباً قادری اور اس خانوادہ کے رکن اول و اعلیٰ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی عقیدت و ارادت عشق کے درجہ پر پہنچی ہوئی ہے، جس کا اظہار متعدد غزلوں میں آپ نے کیا ہے، مثلاً ایک پوری غزل حضرت غوث پاک کے متعلق ہے فرماتے ہیں:

دستگیری کا طلبگار ہوں شیئا للہ
میر بغداد میں نا چار ہوں شیئا للہ

حال دل شرم سے اب تک نہ کہا تھا لیکن
آج میں در پئے اظہار ہوں شیئا للہ

کرم خاص کے لائق تو نہیں میں پھر بھی
آپ کا غاشیہ بردار ہوں شیئا للہ

آپ ہی سنئے کہ اب اور کہوں میں کس سے
بستہ دامن سرکار ہوں شیئا للہ

مجھ سے اب دین کی پستی نہیں دیکھی جاتی
غلبۂ کفر سے بیزار ہوں شیئا اللہ

پائے رفتن ہے نہ ہے ہند میں جائے ماندن
سخت مشکل میں گرفتار ہوں شیئا للہ

غوث اعظم سے جو مانگو گے ملے گا حسرت
پس کہو حاضر دربار ہوں شیئا للہ(۱)

ایک دوسری نعتیہ غزل میں فرماتے ہیں(۲):

رہنمائے گمرہان و سرگروہِ مقبلان
عاشق و معشوق یزدان جان و جانان رسولؐ

مقتدائے سالکان و مخزن اسرار حق
پادشاہِ عاشقان و گنج عرفان رسولؐ

نور چشم فاطمہ درخشان علی
غوث اعظم شاہ جیلاں ماہ تابانِ رسولؐ

حسرت محروم ہے امید وار التفات
اس طرف بھی اک نظر اے میر سامانِ رسولؐ

---

(۱) یہ بات قیاس از بعید ہے کہ مولانا کے اندر بدعت کا شائبہ تھا کیونکہ مولانا مذہباً حنفی تھے اور از روئے حنفیت یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مولانا کے سیدنا غوث پاک شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے غایت درجہ محبت اور تعلق کا اظہار تو ہوسکتا ہے لیکن ان اشعار کو بدعت پر محمول کرنا خلاف واقعہ ہے۔ (دیوان حسرت موہانی حصہ دوم مشمولہ کلیات حسرت موہانی ص:۲۳۹)

اشتیاق اظہر لکھتے ہیں: حضرت مولانا حسرت موہانی سید الاحرار مذہباً حنفی اور مشرباً قادری تھے، آپ نے خود تسلیم کیا ہے کہ؛ آپ قدامت پسند سنی اور صوفی ہیں، آپ کو حضرت امام موسیٰ کاظم اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی خصوصی عقیدت تھی، آپ کا پورا خاندان حضرت شاہ عبدالرزاق فرنگی محلیؒ کا ارادت مند تھا اور آپ خود بھی بچپن میں ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے تھے، بعد میں آپ نے ان کے صاحبزادے اور جانشیں حضرت مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی سے بیعت کی اور اس کے بعد آپ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ سے باقاعدہ خلافت ملی اور بعض افراد کو باقاعدہ مرید بھی کیا۔ (سید الاحرار ص:۲، حصہ اول، ذاتی زندگی، مصنف: اشتیاق اظہر، مطبوعہ ۱۹۸۸ء)

(۲) دیوان حسرت موہانی حصہ چہارم مشمولہ کلیات حسرت موہانی ص:۲۹۸

ان دونوں غزلوں سے میر بغداد کے حضور میں آپ کی ارادتمندی وفرط عقیدت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

بیعت وارشاد (مرتب)

مولانا نے بچپن ہی میں مولانا شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت کی تھی اس کے بعد آپ کے صاحبزادے یعنی مولانا عبدالباری صاحب کے والد ماجد سے پھر تجدید بیعت کی، یہ خاندان قادری المشرب ہے اسی سلسلے میں حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب کی نسبت ایک غزل میں فرماتے ہیں:

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگ جاں کے قریب — آن پہنچے ہیں مگر منزل جاناں کے قریب
حشر میں اپنے گناہوں سے مجھے خوف کیا — ان کی رحمت بھی تو ہی منزل عصیاں کے قریب
لپٹے اس ڈھب سے کہ پھر ہو نہ جدا خاک مری — کہیں پہنچے بھی تو اس گوشۂ داماں کے قریب
لکھنؤ آنے کا باعث یہ کھلا آخر کار — کھینچ لایا ہے دل اک شاید پنہاں کے قریب
وہ جو ہیں پاس تو محبس بھی ہے ایک باغ ہمیں — کامرانی بھی نمودار ہے حرماں کے قریب
روز ہو جاتی ہے رویاء میں زیارت حسرتؔ — آستانِ شہ رزاق ہے زنداں کے قریب (۱)

اصل غزل شروع ہوتی ہے اس شعر کے ساتھ ''روح محشر گستر ہے جو دامانِ رسولؐ''

یہ غزل مولانا نے اس وقت لکھی تھی جب کہ آپ کا تبادلہ فیض آباد سے لکھنؤ سینٹرل جیل میں ہوا تھا، آستانہ شہ رزاق سے مراد حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب ہیں اور مقطع سے پہلے شعر میں باغ سے مراد درگاہ شریف ہے جو کہ مولوی انوار کا باغ کے نام سے مشہور ہے۔

مولانا کو تصوف کے ساتھ ایک غیر معمولی لگاؤ ہے چنانچہ غزلوں میں اکثر اس کا اظہار فرمایا ہے:

(۱) (دیوان حسرت موہانی حصہ چہارم مشمولہ کلیات حسرت موہانی ص:۲۹۴)

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا　　شغل بیکار ہیں سب ان کی محبت کے سوا
دے سکا کوئی نہ دہری کے وساوس کا جواب　　تیرے دیوانۂ وارفتہ طبیعت کے سوا
قول زاہد کو غلط ہم نہیں کہتے ہیں مگر　　اور کچھ ہو بھی طریقت میں شریعت کے سوا
اہل ظاہر نہ کریں کوچۂ باطن کی تلاش　　کچھ نہ پائیں گے وہاں رنج و مصیبت کے سوا
سب سے منھ موڑ کے راضی ہیں تیری یاد سے ہم　　اس میں ایک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا(۱)

نعت میں بھی کئی غزلیں موجود ہیں اور اہل بیت اطہار سے بھی خاص تعلق خاطر ہے، جس کو ایک غزل میں ظاہر کیا ہے، جس کی ردیف و قافیہ ''جان اولیا، بستان اولیاء'' ہے۔ تصوف سے یوں نہ تو فطرتاً مولانا کو خاص تعلق تھا، لیکن موجودہ قید فرنگ میں اس رنگ نے اور بھی پختگی اختیار کر لی ہے، حسرت کا قول ہے کہ تصوف جانِ مذہب ہے اور عشق جانِ تصوف، العشق ہو اللہ، ہو اللہ کا اکثر ورد رکھتے ہیں، یہ مذاق اس قدر طبع حسرت پر غالب ہے کہ ان کے کلام میں ہر جگہ اس کی جھلک آپ کو نظر آسکتی ہے۔

متفرق حالات

قبل اس کے کہ ہم موجودہ نظر بندی زندان کے مسئلہ پر بحث کریں چند متفرق امور کا ذکر کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں، یہ متفرق حالات و واقعات خود بیگم صاحب کی ایک تحریر سے ماخوذ ہیں وہ فرماتی ہیں: لاہور اور بنارس کے مقدمات سازش میں بعض سرکاری گواہوں نے شرارت سے حسرت کا نام بھی اپنے بیان میں لیا اس کے متعلق لوگوں نے حسرت سے بہت کچھ اصرار کیا کہ تم اپنی وفاداری کا بیان پانیر وغیرہ میں شائع کرا دو، تاکہ گورنمنٹ کا شبہ رفع ہو، مگر حسرت نے اپنی خود داری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، خاموش رہے۔

(۱) دیوان حسرت موہانی حصہ چہارم مشمولہ کلیات حسرت موہانی ص:۲۹۱

اس سلسلے میں ایک بے بنیاد افواہ یہ بھی مشہور ہے، کہ لارڈ مینٹو ریم پھینکنے سے انھوں نے انارکسٹ کو باز رکھا، مسز حسرت موہانی فرماتی ہیں: یہ بھی بالکل غلط ہے۔

مولانا حسرت فرماتے ہیں کہ: میں نے کوئی امتحان ایسا نہیں دیا کہ جس کے بعد مجھے کامیابی کا یقین نہ ہو، چنانچہ علی گڈھ کالج سے بی اے کا امتحان دیتے ہی نتیجہ کا انتظار کیے بغیر اردوئے معلیٰ کا اشتہار شائع کر دیا تھا۔

اردوئے معلیٰ نے پالٹیکس میں اس وقت سے حصہ لینا شروع کر دیا تھا جبکہ اس خیال کو سخت ترین معصیت سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس وقت مسلمانوں میں حسرت کا ایک بھی ہم خیال نہ تھا، الا ماشاء اللہ مسٹر مظہر الحق اس وقت صفی پور میں منصف تھے، اور پالٹیکس میں حصہ لے بھی نہیں سکتے تھے، حسرت سے ان کی شناسائی ادبی تحریک کی بنا پر ہوئی تھی، مسٹر محمد علی بھی ۱۴ء تک حسرت سے اختلاف رکھتے تھے، غرضیکہ عام طور سے حسرت کی پالیسی سے مسلم لیڈروں کو اختلاف تھا، البتہ صرف ایک مولانا شبلی مرحوم تھے، جنھوں نے ابتداء ہی سے حسرت کی تائید اور ۱۹۰۴ء میں اردوئے معلیٰ کا پہلا سیاسی مضمون دیکھ کر داد دی تھی اور لکھا تھا

اینکہ گفتی حکایت سحر است ☆ روز روشن ہنوز در قدر است

ذیل کے دو اتفاقی واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ایک تو یہ کہ علی گڈھ کالج میں حسرت ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے خاص اصرار اور تحریک سے آئے اور آخر تک ریاضی کو نہ چھوڑا، یہاں تک کہ بی اے ریاضی میں پاس کیا، دوسرے یہ کہ اردوئے معلیٰ میں سب سے پہلا سیاسی مضمون شیخ عبداللہ صاحب نے لکھا مگر اب یہی دونوں بزرگ علی گڈھ میں حسرت سے سب سے زیادہ اختلاف رکھتے ہیں۔

مولانا حسرت کی حسن نیت اور خلوص وللّٰہیت کا اندازہ، ان کے ذیل کے مقولہ سے

ہوسکتا ہے، ان کا قول ہے کہ: ان کی مختلف لوگوں سے مختلف حیثیتوں سے ملاقات ہے، وہ سب کے دوست ہیں، کسی کے دشمن نہیں اور نہ ان کا کوئی دشمن ہے، یہ آخری جملہ گو صحیح نہ ہو، مگر مولانا حسرت کے اعلیٰ اخلاق اور ان کے حسن نیت پر دال ہے۔

حسرت کی ادبی خدمات

حسرت کی ادبی خدمات اس قدر روشن اور واضح ہیں کہ ان کا ذکر کرنا تحصیل حاصل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، انھوں نے اردوئے معلیٰ کے ذریعہ اردو لٹریچر کی نہایت گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، خصوصاً اردو شاعری پر انھوں نے احسان عظیم کیا ہے، سینکڑوں غیر معروف شعراء کے حالات اور شاعری سے لوگوں کو آگاہ کیا اور ان کے کلام سے لوگوں کو روشناس کرادیا، بہت سے اساتذہ کے کلام کو تلف ہونے سے بچالیا، شعرا کے تذکرے مرتب کرکے شائع کیے اور ان کے کلام پر تنقیدیں لکھیں جس سے پاکیزہ مذاقِ سخن کی شناخت ہوئی، اور لوگ صحیح مذاق سے آشنا ہوگئے، ان تمام امور سے قطع نظر کرلی جائے تو صرف حسرت کی شاعری اردو لٹریچر کے لیے مایۂ ناز اضافہ سے تعبیر کی جاسکتی ہے، ہم یہاں حسرت کی شاعری پر تنقید نہ کریں گے اگر ممکن ہوا تو اخیر میں بعض سیاسی مضامین کے اشعار کا انتخاب درج کریں گے، فی الحال ادبی تحریک کے متعلق صرف اسی قدر لکھنے پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔(۱)

---

(۱) حسرت موہانی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا، انھوں نے اپنی زندگی میں دو رسالے ''اردوئے معلیٰ'' اور ''تذکرۃ الشعراء'' اور ایک اخبار ''مستقل'' نکالے

''اردوئے معلیٰ'' اس کا سب سے پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۳ء میں منظر عام پر آیا۔(حسرت موہانی حیات اور کارنامے ص:۲۷۱)

''مستقل'' حسرت نے کان پور سے ۱۹۲۸ء میں ''مستقل'' نام سے ایک روزنامہ شروع کیا۔

''تذکرۃ الشعراء'' حسرت نے جولائی ۱۹۱۴ء سے ''تذکرۃ الشعراء'' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا۔ (حسرت موہانی ص:۲۶۱، خلیق انجم)

حسرت کی چند خصوصیات

ایک بزرگ وقابل فرزانہ انسان میں جس قدر خوبیاں اور محاسن ہونے چاہئیں وہ سب حسرت کی ذات میں بوجہ اتم پائی جاتی ہیں اور اسلامی اخلاق وفضائل کے تمام صفات حسنہ کے وہ دور موجود ہیں مکمل نمونہ ہیں، مثلاً صدق وخلوص، زہد وورع، دیانت وتقویٰ، عزم واستقلال، ایثار وفدویت یہ تمام باتیں بفضلہٖ حسرت میں واقعی طور سے موجود ہیں، اور صرف کہنے کے لیے اور محض اسٹیج پر ان کی نمائش کرنے کے لیے نہیں بلکہ حقیقتاً اور واقعتاً وہ ان تمام صفات حسنہ سے موصوف ومتصف ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کا بدترین مخالف بھی ان کی انہیں خوبیوں کی بنا پر ان کا احترام کرتا ہے۔

حسرت کی ذات اپنے اندر ایک نمایاں خصوصیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ سوائے اختلاف رائے کے اور ان کی کسی بات سے لوگوں کو اختلاف نہیں اور نہ اخلاقی حیثیت سے ان پر آج تک کسی نے کوئی اعتراض کیا، تمام ملک ان کی حسن نیت کا قائل اور ان کے خلوص وللّٰہیت کا مقر ہے اور ان کی حریت پسندی ووطن پرستی کے جذبات کو حب جاہ اور طلب نام و نمود وغیرہ سے بالکل منزہ اور پاک سمجھتا ہے اور ہر شخص ان کی سچائی کا معترف ہے۔

حسرت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ: تمام اسلامی ہند میں سب سے پہلے جس شخص کے پاؤں میں وطن پرستی کے جرم بے جرمی میں مقدس بیڑیاں ڈالی گئیں وہ اس دیوانہ حریت وآزادی یعنی حسرت موہانی کا پاؤں تھا۔

تیسری خصوصیت ان کی یہ ہے کہ: وہ اس وقت سے راہ حق اور صراط مستقیم پر چل رہے ہیں؛ جبکہ سیاسی عقائد کے لحاظ سے تمام اسلامی ہند گمراہ تھا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج انھیں کی پالیسی پر تمام لوگ حامل ہیں، یہ ان کی سچائی اور ان کے عقیدہ کی استقامت کی نہ صرف دلیل ہے بلکہ؛ یہ ان کی فتح ہے، جس پر جس قدر چاہیں فخر کر سکتے ہیں کہ اولیت کے

مجد وشرف کے لیے خداوند قدوس کے دست قدرت نے ان کو چن لیا تھا، گویا ضلالت و گمراہی سے کبھی ان کا قلب آشنا نہیں ہوا اور اول دن ہی سے وہ مومن و مسلم تھے یعنی ایسا نہیں ہوا کہ پہلے وہ غلامی پسند و استبداد دوست ہوں، بعد میں واقعات و تجارب نے تبدیلی رائے پر ان کو مجبور کر دیا ہو، وہ زمانہ کی کسی انقلابی طاقت سے متاثر نہیں ہوئے؛ بلکہ خود انہیں کے حالات و کیفیات نے انقلابی صورت پیدا کر دی، اور ایک دنیا اس دور انقلاب کے ماتحت آ گئی۔

حسرت جہاں پہلے دن کھڑے تھے، وہیں اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑے رہے، دوسرے لوگ البتہ نیچے پستی میں استبداد و استعباد کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے، انھوں نے ترقی کی اور حسرت کے برابر آ کر کھڑے ہو گئے۔

لیکن باوجود ان تمام محامد و فضائل کے حسرت نے اپنی شخصیت کو ایک لیڈر کی حیثیت سے کبھی نمایاں نہیں کیا، اور نہ کبھی رہنمائی و پیشوائی کی، اس عزت کی طرف ایک قدم بڑھایا جس کے حصول کی آرزو میں سینکڑوں خانہ ساز لیڈر بن گئے، آج تک نہ کبھی ان کی گاڑی کھینچی گئی اور نہ پھولوں کے ہار ان کے گلے میں پہنائے گئے، نہ ان کا کہیں استقبال کیا گیا، اور نہ پذیرائی کی تمنا کبھی ان کے دل میں پیدا ہوئی، وہ پیدل چل کر جلسوں میں شریک ہوتے، تھرڈ کلاس میں سفر کرتے، معمولی سودیشی کپڑے پہنتے اور معمولی سادہ غذا کھاتے پیتے رہے، جو لوگ حسرت کی زندگی سے واقف ہیں، ان کو معلوم ہے کہ اس عہد نام و نمود اور اس دور فساد و نفاق میں حسرت کا گرامی قدر وجود اپنے اندر کیسی قدویت رکھتا ہے اور ان کے اخلاق و صفات کس درجہ متخلق باخلاق اللہ ہیں۔

قانون مطابع کی جابرانہ دست درازیاں جس وقت سے اسلامی ہند پر شروع ہوئیں تو ہندوستان میں سب سے پہلا اسلامی پریس جس پر تلوار چلائی گئی وہ حسرت ہی کا اردو پریس تھا، اردو پریس کی تمام کائنات اور ساری حقیقت صرف اس قدر تھی کہ ایک کاٹھ کی دستی

مشین اور تین پتھر تھے، جس میں دو جز کا ماہوار اردوئے معلیٰ چھپتا تھا اور بس، بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ خود حسرت نے مشین چلائی اور قلیوں کی طرح کام کر کے رسالہ کو اس کے وقت پر شائع کر دیا۔

ایسے بے حقیقت پریس سے جس سے ایک حبہ آمدنی کبھی نہیں ہوئی، سر جیمس مسٹن کی گورنمنٹ نے پورے تین ہزار کی ضمانت طلب کر لی، یعنی اپنے پورے اختیارات غریب حسرت پریس کے برباد کر دینے میں صرف کر ڈالے، ایک ایسے پریس سے جس میں کوئی آمدنی نہ ہوتی ہو اور ایک ایسے شخص سے جو سود و سو روپیہ کا بھی انتظام نہ کر سکتا ہو اس سے تین ہزار کی ضمانت طلب کر لینا، سوائے جذبہ انتقام کے اور کس امر پر محمول کیا جا سکتا ہے، اس ضمانت طلبی کا مدعا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ پریس قطعی طور سے بند کر دیا جائے۔ حالانکہ ضمانت وغیرہ کا لینا صرف اس غرض سے ہوتا ہے کہ آئندہ سے احتیاط کی جائے نہ یہ کہ سرے سے پریس کو غارت کر دیا جائے، اس کو کوئی مہذب گورنمنٹ جائز نہیں رکھتی، مگر حسرت کے صداقت شعار دل نے اس قربانی کو بھی برداشت کر لیا، اور جس شخص کے جذبۂ صادق کو زندان فرنگ کی آہنی بیڑیاں زائل نہ کر سکیں اور جو قید کی پر مشقت زندگی بسر کرنے کے بعد بھی اپنے عقیدہ میں ترمیم کرنے پر مائل نہ ہوا، بھلا ایسے پیکر صدق و صفا اور ایسے مجسم خلوص و وفا کو پریس ایکٹ کی جابرانہ سختیاں اپنی جگہ سے کیا جنبش دے سکتی ہیں۔

چنانچہ حسرت کے قلب پر اس واقعہ کا ذرہ برابر کوئی اثر نہیں ہوا، یہ صحیح ہے کہ وہ تین ہزار کی رقم فراہم نہیں کر سکتے تھے اور بالآخران کو پریس اور اس کے ساتھ ہی اردوئے معلیٰ بند کر دینا پڑا۔

تاہم انہوں نے آخری پرچہ میں اعلان کر دیا کہ گو اردوئے معلیٰ بند کر دیا گیا مگر میری زبان میرا دل اور میری قوت عمل ہنوز آزاد ہے اور میں جس طرح پہلے کام کرتا تھا اب

بھی خدا کی بخشی ہوئی طاقت سے کام لوں گا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ طرابلس میں جنگ ہوئی تھی، مولانا حسرت نے اٹلی کے خلاف بائیکاٹ کا فتویٰ شائع کیا تھا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ مسلمانوں کو آپ اس امر پر آمادہ کر رہے تھے کہ وہ اٹلی کا مال خریدنا ترک کر دیں۔

حسرت کی یہ بیبا کی گورنمنٹ کو خوش نہیں آئی، غالباً اس جدوجہد اور سعی و کوشش کو روکنے کے لیے یہ تدبیر کی گئی تھی، مگر گورنمنٹ کے اس طرز عمل سے مولانا حسرت کا جوش عمل اور بھی ترقی پکڑ گیا اور وہ ہمہ تن اس تحریک کو فروغ دینے میں مصروف ہو گئے، اور اردوئے معلیٰ کے بجائے تذکرہ شعراء کے نام ایک سہ ماہی رسالہ نکال کر ادبی خدمت گذاری کے سلسلے کو جاری رکھا۔

جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان شروع ہو گئی اور تمام عالم اسلامی ایک سخت آزمائش میں پڑ گیا، مولانا اس زمانہ میں بھی خاموشی کے ساتھ خدمت کرنے میں مصروف رہے پھر اسی دوران میں واقعہ سائلہ کانپور کا حدوث ہوا اس میں بھی مولانا خاموش نہیں رہے۔ غرضیکہ حسرت کی ساری زندگی قوم وملک کی خدمت فرمائی میں بسر ہوئی۔

ان واقعات کے بعد کوئی اہم سیاسی معرکہ پیش نہیں آیا سوائے مسٹر محمد علی و وزیر حسن اور مسٹر امیر علی کے مشہور اختلاف کے اس میں بھی مولانا نے مسٹر محمد علی کی حمایت کی۔

ان واقعات کے بعد مولانا کی تمام تر توجہ سودیشی تحریک کی توسیع واشاعت اور مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ کی طرف منعطف ہو گئی، کیونکہ یہی وہ مسئلہ اس وقت نہایت اہم اور ضروری تھے انہیں مسائل مہمہ میں مولانا مصروف تھے کہ موجودہ جہانسوز و عالمگیر جنگ شروع ہو گئی، اس دوران میں مولانا نے کسی سیاسی معاملہ میں زیادہ انہماک سے کام نہیں لیا اور دو برس خاموشی کے ساتھ گذارے تھے کہ بالآخر مصائب وآلام کے ایک نئے باب کا ان کی زندگی میں اضافہ کیا گیا۔

ابتلاء وآزمائش کا دورِ ثانی

ایسے عہد تاریک ومظلم اور دور فساد ونفاق میں کہ نئے نئے طریقہ وضع ہو رہے ہیں، اور ظلم وزیادتی کرنے کے لیے قوانین بنائے جا رہے ہیں، حسرت جیسے پرستار حق وحریت کا آزاد اور ایک سخت گیر حکومت کی گرفت سے ان کا بچا رہنا تعجب انگیز امر تھا۔

لوگ متحیر تھے کہ آخر مولانا حسرت کو خدمت گذاری حق وصداقت کا معاوضہ اب تک کیوں نہیں ادا کرنا پڑا وہ حسرت جو قربانگاہ ابتلاء وآزمائش میں ہمیشہ سب سے آگے رہا اور فدویت وایثار کے میدانِ امتحان میں سب پر سبقت لے گیا وہ آج جبکہ اقلیم صداقت کو ویران کر کے جیل خانہ آباد کیے جا رہے ہیں کیوں دوسروں سے پیچھے رہ گیا، لیکن اس میں کوئی حیرت واستعجاب کی بات نہیں ہے کیونکہ جس طرح وہ ہمیشہ برداشت مصائب وآلام میں دوسروں سے منفرد وممتاز رہا اسی طرح اس مرتبہ بھی گو قدرے پیچھے رہا مگر تمام پرستارانِ حریت وآزادی سے وہ ممتاز رہا، یعنی دوسرے بزرگانِ قوم ومصلحان ملک وملت کی طرح وہ صرف نظر بند نہیں کیا گیا، اس کے پاؤں کی حرکت اور زبان کی جنبش کی گئی ایک شہر کے اندر محدود نہیں کر دی گئی بلکہ اس کی حریت پرستی وصداقت کیشی جیل کی تنگ وتاریک کوٹھری کی مستحق تھی چنانچہ وہ سرگروہ سربازان حریت وصداقت اپنے مرتبت اعلیٰ واقدس کے مطابق جیل میں معتکف ہوا۔

یوں تو مولانا حسرت موہانی کو کامل آزادی کبھی نصیب نہیں ہوئی، یعنی ہمیشہ ہمہ وقت سی آئی ڈی کے آدمی سفر وحضر میں ان کے ساتھ ہی رہا کرتے تھے، مگر حسرت کے لیے کوئی قید وبند نہیں تھی کہ اگر کہیں جائیں تو اجازت وغیرہ لیں، اس کی کامل نگرانی کی ذمہ داری سی آئی ڈی پر تھی، اسی حال میں مولانا اپریل ۱۹۱۶ء تک آزاد رہے، لیکن مئی ۱۹۱۶ء میں مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ سے واپس آنے کے دو تین ہی روز بعد پہلے ان کی

خانہ تلاشی ہوئی اور پھر نظر بندی کا حکم صادر ہوا۔

مولانا نے اس حکم کے خلاف لوکل گورنمنٹ سے خط و کتابت کی اور ایک عرض داشت ارسال کی مگر چونکہ جس وقت حکم سنایا گیا تھا اسی وقت اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ آپ بفتوائے ضمیر ہر ایسے حکم کی پابندی کو مذہباً ناجائز سمجھتے تھے جس میں نہ جرم کی نوعیت سے آگاہ کیا جائے اور نہ ملزم کی صفائی کا موقع دیا جائے، غالباً اس بناء پر آپ کو علی گڈھ سے للت پور لے گئے حالانکہ انصافاً مقامی حکام کو یہ حق حاصل نہ تھا کیونکہ مولانا کا معاملہ ابھی لوکل گورنمنٹ کے زیر غور تھا اور وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تھا اور جب تک وہاں سے جواب نہ آجاتا اس وقت تک مولانا پر عدول حکمی کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا لیکن اس کی پرواہ نہیں کی گئی اور لوکل گورنمنٹ کے احکام انتظار کیے بغیر مولانا کو ان کی مرضی کے خلاف للت پور بھیج دیا گیا اور وہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے اجلاس میں عدول حکمی کا مقدمہ دائر کر دیا گیا اور مجسٹریٹ نے آناً فاناً چند گھنٹوں میں فیصلہ سنا دیا اور تین مختلف الزامات میں دو سال کی قید محض تجویز کر دی۔

اس معاملہ میں کئی ایک ناانصافیاں مولانا کے ساتھ کی گئیں:

(۱) قانون تحفظ ہند کے جرائم کی تحقیقات صرف لوکل گورنمنٹ کے مقرر کردہ کمشنر ہی کر سکتے ہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس بارہ میں مطلق کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

(۲) ملزم کو اس کی مرضی کے خلاف للت پور میں لایا گیا تو مقدمہ للت پور میں نہیں ہو سکتا تھا۔

(۳) جب لوکل گورنمنٹ کے ساتھ خط و کتابت جاری تھی اور حکم نظر بندی کے خلاف ملزم کی عرضداشت لوکل گورمنٹ کے زیر غور تھی تو اس پر عدول حکمی کا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا تھا۔

اس کے علاوہ سب سے بڑی زیادتی اور ناانصافی یہ کی گئی کہ ملزم کو مقدمہ کی پیروی کرنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کا مطلق موقع نہیں دیا گیا، ظاہر ہے کہ ایسے دور افتادہ مقام پر جہاں نہ مولانا کا کوئی شناسا ہو اور نہ دوست وملاقاتی وہاں وہ چند گھنٹہ میں کیا کر سکتے تھے، نہ بحث کے لیے کوئی وکیل اور نہ اتنی مہلت کو مقدمہ کی کارروائی کو ترتیب دے کر جو غلط الزامات لگائے گئے تھے ان کی صفائی پیش کی جا سکے، گویا بالکل خود مختارانہ طریق سے ایک طرفہ فیصلہ کر دیا گیا۔

مولانا نے اس جابرانہ اور نامنصفانہ فیصلہ کی اپیل سیشن جج کی عدالت میں پیش کی مگر جہاں انتظامی اور عدالتی حکام میں کوئی فرق وتمیز نہ ہو اور انتظامی عمال کا دست دراز ہمیشہ کارفرما رہے وہاں ایسے معاملات میں انصاف پروری ومعدلت شعاری کی توقع رکھنا ایک مضحکہ خیز امر ہے، سیشن جج نے بھی اپیل نامنظور کر دیا اس کے بعد مولانا نے ہائی کورٹ سے مرافعہ کرنے کی اجازت چاہی مگر یہ بھی مسترد کر دی گئی اور درخواست نامنظور کر کے ہمیشہ کے لیے انصاف کا دروازہ بند کر دیا۔

اس مرتبہ مولانا کی نظر بندی اور جیل خانہ پر ملک وقوم کی طرف سے اس سرد مہری و بے نیازی کا اظہار نہیں کیا گیا جو ۱۹۰۸ء میں کیا گیا تھا، بلکہ اس کے خلاف مولانا کی صداقت پژدہی وحق گوئی اور ان کے اعلیٰ صفات واخلاق سے دنیا اچھی طرح واقف ہو چکی تھی اور ان صفات عالیہ کی قدر ومنزلت سے ذوق آشنا ہو گئی تھی، یا یوں کہیے کہ حسرت کے اصول حریت پرستی کو تمام باطل عقائد سیاسیہ پر کامل غلبہ اور فتح حاصل ہو چکی تھی اس لیے گو جس اہمیت کا سزاوار مولانا کا معاملہ رہتا اس کا اظہار نہیں کیا گیا، تاہم ملک کے ہر ہر گوشہ سے مولانا کی بے قصور سزا وہی نظر بندی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور گورنمنٹ کو توجہ دلائی گئی، خصوصاً ذیل کے مقامات پر کئی کئی بار جلسہ منعقد ہوئے اور ان میں گورنمنٹ

کے حکم کے خلاف اظہار ناراضی کیا گیا، متھرا، فیض آباد، میرٹھ، حیدرآباد وسندھ، دہلی، کلکتہ، سلطانپور، کھیری لکھیم پور، کانپور، علی گڈھ، لکھنؤ، الٰہ آباد، بریلی، مرادآباد، آگرہ، ان مقامات پر تو متعدد بار جلسہ ہوئے لیکن ان کے علاوہ بھی اکثر مقامات پر پرزور جلسے ہوئے اور ان میں ملک کے ممتاز مقررین نے تقریریں کیں۔

علی ہذا؛ صحافت وطنی نے بھی اپنی پوری قوت سے، ان جابرانہ احکام کے خلاف صدائیں بلند کیں، اور نہ صرف اردو صحافت نے بلکہ؛ انگریزی اخبارات میں بھی مضامین لکھے گئے، لیکن باوجود اس کے گورنمنٹ اپنی ضد پر قائم رہی، بلکہ روز بروز اور سختی اختیار کرتی گئی، مثلاً یہ کہ ان کو کسی ایک جگہ جیل میں بھی نہیں رہنے دیا گیا، بلکہ مختلف مقامات کے جیل خانوں میں ان کو چکر پھیری پھروائی گئی، پہلے للت پور میں رکھا گیا تھا کیونکہ وہیں سزا دی گئی تھی، اس کے بعد بلاوجہ وہاں سے جھانسی تبدیل کر دیا گیا، اور جھانسی سے بھی الٰہ آباد جیل میں روانہ کر دیا گیا، الٰہ آباد میں تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ پرتاپ گڈھ بھیج دیا گیا، یہاں بھی خوف دامنگیر ہوا، کہ مبادا بے دست و پا حسرت کوئی آفت نہ ڈھائے، چنانچہ پرتاپ گڈھ سے فیض آباد جیل میں آپ کو بھیجا گیا لیکن پھر بھی وہم نے ستایا تو لکھنؤ کے جیل کو مناسب سمجھا گیا مگر بہت زمانہ نہ گذرنے پایا تھا کہ حکام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ آج کل لکھنؤ کی سرزمین سیاست کی رزمگاہ بنی ہوئی ہے، اور یہاں حسرت کا رکھنا خوف وخطرہ سے خالی نہیں، چنانچہ لکھنؤ سے پھر فیض آباد جیل میں آپ کو واپس کیا گیا آخر میں فیض آباد سے میرٹھ جیل پر اس جبریہ زندان نوردی کی مدت میعاد سزا کے ساتھ ختم ہوئی۔

اس زبردستی اور بلاوجہ کی چکر پھیری کا نتیجہ غریب حسرت کے لیے یہ نکلا کہ ان کی صحت جسمانی نہایت خراب ہوگئی اور روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی گئی اور چالیس پونڈ کے قریب ان کا وزن گھٹ گیا۔

خرابی صحت کی تمام تر ذمہ داری گورنمنٹ پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ اول تو جہاں کہیں بھی ان کو رکھا گیا، وہاں کی آب وہوا حسرت کے ناموافق ثابت ہوئی، اس کے علاوہ اگر کسی ایک ہی مقام پر ان کو رکھا جاتا، تو شاید رفتہ رفتہ اس مقام کے آب وہوا کی طبیعت خوگر ہو جاتی۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ جہاں دو چار مہینہ کئی ایک مقام پر گذرے اور طبیعت وہاں کی آب وہوا سے مانوس ہونے لگی، اور فوراً گورنمنٹ نے دوسرے مقام پر تبدیل کر دیا اور اس یکا یک نئے اور غیر مانوس مقام پر جانے اور وہاں سے رہنے سے پھر صحت خراب ہوگئی، غرضیکہ اسی طرح تقریباً سارا زمانہ علالت و بیماری میں بسر ہوا۔

یوں تو عموماً ملک وقوم کی طرف سے گورنمنٹ کے اس طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی اور ریزولیشن کی صورت میں گورنمنٹ سے خواہش کی گئی کہ کم از کم حسرت کو علی گڈھ جیل میں قیام کرنے کی اجازت دی جائے مگر خصوصیت کے ساتھ مولانا حسرت کی بیگم صاحبہ کو ان کی خرابی صحت کی وجہ سے زیادہ اضطراب رہا اور انھوں نے کوشش کی کہ حسرت کو علی گڈھ جیل میں رکھا جائے۔

چنانچہ اس غرض کے لیے بیگم صاحبہ نے کوشش کی کہ وہ ہز آنر سر جیمس مسٹن سے ملاقات کریں، اور یہ عرض داشت پیش کریں، اس کام کے لیے انھوں نے سید آل نبی وغیرہ کا توسط تلاش کیا مگر بیگم صاحبہ پھر بھی ہز آنر سے ملاقات نہیں کر سکیں، صرف سید آل نبی کے ذریعہ سے اپنی عرض داشت روانہ کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

مولانا حسرت کی خرابی صحت سے تمام ملک میں تشویش و اضطراب پھیل گیا، اور اخبارات نے آخر وقت تک گورنمنٹ کو توجہ دلائی کہ وہ اس طرز عمل کو کہ آج یہاں اور کل وہاں چھوڑ کر مولانا کو علی گڈھ میں رہنے کی اجازت عطا فرمائیں، مگر سر جیمس مسٹن کی حکومت کو خدا معلوم حسرت کے وجود میں ایسی کیا مخفی قوتیں نظر آتی تھیں کہ علی گڈھ پہنچتے ہی زندانِ

فرنگ کی زنجیروں اور بیڑیوں کے باوجود ایک طوفان عظیم برپا ہو جانے کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہا اور شاید کچھ ایسی ہی وجوہ ہوں گی جن کی بنا پر حسرت کو علی گڈھ رہنے کی اجازت کسی طرح نہ دی گئی۔

مولانا حسرت پر ابتداءً کسی الزام کی تخصیص نہیں کی گئی تھی بلکہ عام نظر بندوں کی طرح وہی معمولی الفاظ کے ذریعہ حکم نظر بندی دیا گیا تھا لیکن بار بار کونسلوں میں سوالات کے بعد بالآخر گورنمنٹ نے مہر سکوت توڑی بھی تو عجیب بے بنیاد الزام ان پر لگا دیا، یعنی یہ کہ وہ گورنمنٹ کے خلاف سخت ترین افعال کے مرتکب ہوئے ہیں یا ہونے والے تھے اس وجہ سے ان کی نظر بندی عمل میں لائی گئی، میں نے آخر میں سزائے جیل کی صورت اختیار کر لی۔

حسرت کے لیے یہ کوئی خلاف توقع الزام نہ تھا، اس لیے گورنمنٹ نے اکثر نظر بندوں کے متعلق جب پبلک کا اصرار و مطالبہ بہت بڑھ گیا اور ایجی ٹیشن نا قابل برداشت ہونے لگا تو اس نے یہی طرز عمل اختیار کیا ہے کہ کسی پر ترکوں غدارانہ خط و کتابت کا الزام لگا دیا جیسے مولانا ابوالکلام اور کسی پر ترکوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کا الزام رکھ دیا، جیسے مسٹر محمد علی و شوکت علی، حالانکہ ان تمام حضرات نے گورنمنٹ کو چیلنج دیا کہ اگر اس کے پاس ثبوت کافی ہے تو علانیہ کھلی عدالت میں ان پر مقدمہ چلائے لیکن جس الزام کی بنیاد محض شبہ پر اور صرف سی آئی ڈی کی جھوٹی رپورٹوں پر ہو ان کے خلاف عدالت میں کیونکر مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال کامل ایک سال کے بعد مولانا کی نسبت گورنمنٹ نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ وہ کس وجہ سے نظر بند کیے گئے تھے لیکن صرف گورنمنٹ کا یہ کہہ دینا کہ فلاں شخص قابل اعتراض افعال کا مرتکب ہوا ہے، پبلک کے لیے تشفی بخش نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ گورنمنٹ کے ذرائع معلومات درحقیقت قابل وثوق بھی ہیں کسی کو کیا معلوم کہ گورنمنٹ

محض سی آئی ڈی کی رپورٹ پر حسرت کے معاملہ میں مطمئن نہیں ہوئی، بلکہ اس سے زائد قابل اعتماد ذرائع سے اس نے معلومات حاصل کی ہیں۔

اس اظہار الزام کے بعد قوم وملک کی طرف سے پھر بھی بے اطمینانی کا اظہار برابر معلوم ہوتا رہا اور تمام اسلامی ہند خصوصاً اور تمام متحدہ ہندوستان عموماً حسرت کو بے قصور اور گورنمنٹ کے طرز عمل کو ناواجب و ناروا تصور کرتا رہا مگر وہ حکومت جو ایک دفعہ پورا یقین دلانے کے بعد کہ اکثر نظر بندوں کے مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جائے گا اور ان کو رہا کر دیا جائے گا، پھر دوبارہ اپنی سخت گیر پالیسی پر لوٹ آئی ہو اور کسی ایک نظر بند کو بھی آزادی نہ بخشی ہو، بھلا وہ غریب حسرت کے معاملہ پر کیا توجہ کرتی۔

حسرت کے متعلق تمام پبلک جلسوں کے ریزولیشوں اور اخبارات کے مضامین جب بالکل بے اثر ثابت ہوئے تو آخر میں صوبجات متحدہ کونسل کے غیر سرکاری ہندو مسلم آنریبل ممبران نے ایک متفقہ اور متحدہ میموریل سر جیمس مسٹن کی خدمت میں روانہ کیا، اس میموریل میں صوبہ متحدہ کے تمام غیر سرکاری ممبران کونسل کے دستخط اصلاح ثبت تھے، اور اس میں مولانا حسرت کے معاملہ پر رحم آمیز طریقہ سے دوبارہ توجہ کرنے کی گورنمنٹ سے درخواست کی گئی تھی لیکن اس کا حشر یہ ہوا کہ پہلے تو تین چار ماہ تک اس میموریل پر کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی حالانکہ تمام اخبارات میں اس کا ذکر برابر ہوتا رہا اور گورنمنٹ کو یاددہانی بھی کی گئی، چنانچہ جب کئی ماہ تک اس میموریل کے متعلق گورنمنٹ کا کوئی منشاء معلوم نہ ہوا تو آخر مجبور ہو کر آنریبل مسٹر چیتا ستی نے حسب ذیل سوالات پیش کیے:

(۱) کیا گورنمنٹ کو بااثر اصحاب کا دستخط شدہ ایک میموریل موصول ہوا ہے جس میں ہز آنر سے مسٹر فضل الحسن حسرت موہانی کے معاملہ میں رحم آمیز طریقہ سے غور کرنے کی التجا کی گئی ہے۔

(۲) کیا گورنمنٹ مہربانی سے بتائے گی کہ ہر آنریبل نے ازراہ کرم اس میموریل پر کیا حکم صادر کیا؟

اسی اجلاس کونسل میں آنریبل پنڈت گوکرن ناتھ مصرا نے بھی دو سوالات مولانا حسرت موہانی کے معاملہ کی نسبت کیے تھے مگر ان کا نمبر آنریبل مسٹر چیتا سنتی کے سوال کے بعد رکھا گیا تھا، پنڈت صاحب کا پہلا سوال تو میموریل ہی کے فیصلے کی بابت تھا مگر دوسرا سوال موصوف نے ایک مفید اظہار خیال کی صورت میں ترتیب دے کر پیش کیا تھا، پنڈت صاحب موصوف نے گورنمنٹ سے دریافت کیا تھا کہ:

> اگر حکومت کے نزدیک وجوہ کے باعث ان بندشوں کا ہٹانا ناپسندیدہ نہ ہو جو سید فضل الحسن حسرت موہانی پر از روئے قانون تحفظ ہند عائد کی گئی ہیں تو کیا گورنمنٹ برائے مہربانی سید فضل الحسن کو جیل خانہ سے رہا کر کے انہیں اپنے مکان واقع علی گڈھ میں ایسی بندشوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے گی جو ضروری سمجھی جائیں۔

ان سوالات کا نتیجہ سمجھئے یا کچھ اور بہر حال اس میموریل کی رسید گورنمنٹ کی طرف سے حسب ذیل الفاظ میں آنریبل پنڈت جگت نرائن صاحب کے پاس جن کے توسط سے میموریل بھیجا گیا تھا موصول ہوئی، یہ رسید گورنمنٹ صوبجات متحدہ کے چیف سکریٹری کی معرفت یا ان کی روانہ کی ہوئی آئی تھی جو ذیل میں درج ہے:

> مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں یہ تحریر کروں کہ باشندگان صوبجات متحدہ کا وہ میموریل موصول ہوا جس میں یہ استدعا کی گئی ہے کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی جیل سے رہا کیے جائیں زیر قانون تحفظ ہند جو پابندیاں قائم کی گئی ہیں وہ ہٹادی جائیں، میموریل پر وہ توجہ ہوگی جس کا اس کی وزنی حمایت اس کو مستحق بناتی ہے لیکن جناب لاٹ صاحب بہادر

یہ امید نہیں دلا سکتے کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی پر جو پابندی زیر قانون تحفظ ہند قائم کی گئی تھیں وہ ہٹادی جائیں گی۔

سید فضل الحسن حسرت موہانی کسی سیاسی ایجی ٹیشن کے باعث ان پابندیوں میں نہیں رکھے گئے بلکہ سرکار کے خلاف نہایت سنگین قسم کے افعال ان سے سرزد ہونے کے باعث یہ پابندیاں ان پر ہوئی ہیں اور بریں وجہ ان کے حق میں ان قیود کا سلسلہ ضرور جاری رہنا چاہیے۔

جس الزام کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اس کا علم پہلی مرتبہ اس تحریر کے ذریعہ ہوا تھا لیکن باوجود اس سخت وسنگین الزام کے قائم کر دینے کے پھر بھی حکومت نے امید دلائی تھی کہ میموریل کی وزنی حمایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر غور وتوجہ کی جائے گی، گورنمنٹ کے جواب سے تمام ملک میں کم از کم اس امر کا اطمینان ہو گیا تھا کہ اب مولانا حسرت کو بجائے جیل میں رکھنے کے علی گڈھ میں رہنے کی اجازت دی جائے گی گو قیود نظر بندی ان پر سے نہ ہٹائی جاسکیں۔

آنریبل پنڈت گوکرن ناتھ صاحب مصرا نے جو سوال کیا تھا اس سے بھی اس خیال کو تقویت حاصل ہوئی تھی کہ گورنمنٹ کم از کم اس سوال میں جو مقصد ظاہر کیا گیا ہے اس کو ضرور پورا کر دے گی، اگر چہ یہ کچھ ایسی زیادہ رعایت نہ ہوتی جس کے لیے گورنمنٹ کے آگے درخواست ترحم پیش کی گئی تھی مگر ایسی حالت میں کہ مولانا کی صحت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی اور ان کا وزن دن بدن گھٹتا جاتا تھا اسی کو غنیمت سمجھا گیا تھا کہ علی گڈھ میں قیام کرنے کی اجازت مل جائے گی۔

اب اس رسید کو آئے اور شائع ہوئے بھی خاصا زمانہ گذر گیا اور سر جیمس مسٹن کے دور حکومت کے خاتمہ کا وقت بھی قریب آ گیا مگر ہنوز اس ''وزنی حمایت والے'' میموریل کا کوئی نتیجہ ظہور پذیر نہ ہوا، جس زمانہ میں سر جیمس مسٹن کو الوداعی دعوتیں دی جارہی تھیں اور

آپ باحسرت ویاس جوابی الوداعی تقریریں فرمارہے تھے عین اسی زمانہ میں اخبارات پھر توجہ دلانے لگے کہ کم ازکم اپنے عہد آخرین کے یادگار کے طور پر تو ہز آنر مولانا حسرت کے معاملہ کو یکسو کیے جائیں۔

ہندوستان سر جیمس مسٹن کی چشم التفات کی گردش کا بہت اضطراب و بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا کہ یکا یک پیشگاہ حکومت سے ایک خبر شائع ہوئی کہ حکومت چند شرائط پر مولانا حسرت کو آزاد کرنے پر رضامند تھی مگر انھوں نے آزادی حاصل کرنے سے انکار کر دیا یہ خبر ایسی نہ تھی کہ تمام اسلامی ہند کو خصوصاً اور تمام متحدہ ہندوستان کو عموماً محو حیرت واستعجاب نہ کر دے، لیکن ابھی بہت زمانہ نہ گذرا تھا کہ دو ہی ایک روز کے بعد بیگم صاحبہ حسرت موہانی نے اس طلسم حیرت واستعجاب کو اپنی ایک تحریر سے توڑ کر رکھ دیا، بیگم صاحبہ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ جس کو آزادی کی بہشت زار بتلایا گیا تھا اس میں اور زندانِ میرٹھ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں کوئی فرق نہ تھا۔

محترمہ بیگم صاحبہ نے حسب ذیل تحریر پریس میں روانہ کی تھی:

> ۲۰ر فروری کو ۱۲ر بجے دن کے سپرنٹنڈنٹ پولیس میرٹھ ایک اور یورپین افسر کے ساتھ مولانا حسرت کے پاس جیل میں آئے اور حسرت سے کہا کہ گورنمنٹ تم کو رہا کرنا چاہتی ہے مگر اس شرط پر کہ کٹھور ضلع میرٹھ کے بنگلہ میں جو لب سڑک ہے نظر بندی کی جملہ قیود کے ساتھ رہنا منظور کرو۔
>
> ان قیود کی ایک نقل بھی حسرت کو دی، گاڑی بھی ہمراہ لائے تھے مگر حسرت نے اسے منظور نہیں کیا اور انگریزی میں ایک تحریر لکھ کر واپس کر دی، غالباً حسرت کی تحریر گورنمنٹ کو روانہ کر دی گئی، دیکھئے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

خیر کچھ جو بھی ہو حسرت نے اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے حسرت نے جو طرز عمل اختیار کیا ہے، اس میں ضد اور خود رائی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ بقول حافظ ع

بارہا گفتہ ام وبار دیگری گویم ☆ کہ من دل شدہ این رہ نہ زخود می پویم

میں نے حسرت کی اس کارروائی کو بے حد اطمینان اور خوشی کے ساتھ دیکھا، نظر بندی سے قید ہر حال میں بہتر ہے، حسرت نے خوب کیا مجھے ان سے ایسی ہی امید تھی۔

مولانا حسرت نے گورنمنٹ کے مقید و مشروط حکم نامہ پر جو تحریر لکھ کر واپس کر دیا تھا اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

> میں اب بھی اپنے اس اعلان پر ثابت قدم ہوں جو میں نے ۱۹۱۶ء میں کیا تھا اب بھی میرا ایمان اور میرا ضمیر مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا کہ میں کسی ایسے حکم کی تعمیل کروں جو قانون تحفظ ہند کے ماتحت دیا گیا ہو، اور جس کے ذریعہ سے مجھے ایک ایسے جرم کی سزا دی جاتی ہو جس کا نہ پہلے مجھے کچھ علم ہے نہ کوئی نوعیت معلوم ہے نہ جس کا ارتکاب اپنے علم و یقین میں میں نے کیا ہے، پھر یہ سزا اس طرح دی جاتی ہے کہ مجھے اپنی صفائی یا تردید کا بھی موقع نہ دیا جائے، البتہ میں اتنا اضافہ کر سکتا ہوں کہ اگر بغیر کسی شرط کے آزادی دی جائے تو میں بطور خود اس بات کا وعدہ کرنے کو تیار ہوں کہ حکام کے وہم و شکوک کو رفع کرنے کے لیے کم و بیش گورنمنٹ کے مصالح کا خیال رکھوں گا۔

بیگم صاحبہ حسرت موہانی اور خود مولانا کی تحریر سے آپ صرف اس قدر اندازہ کر سکے ہوں گے کہ مولانا کٹھور میں رہنے سے جیل میں رہنے کو ترجیح دی اور یہ کہ مولانا ہنوز احکام نظر بندی کو ناجائز سمجھتے ہیں لیکن ''وزنی حمایت والے'' میموریل پر ہمدردانہ غور و توجہ کا جو وعدہ کیا گیا تھا جس کا ذکر چیف سکریٹری صاحب نے اپنی رسید میں کیا تھا اس موعودہ غور و توجہ کی پوری حقیقت اس وقت منکشف ہوگی جب آپ کے سامنے وہ شرائط بھی آجائیں جو اس نام نہاد چند روزہ آزادی کے بالمقابل گورنمنٹ نے تجویز کی تھیں۔

اگر چہ حکم نامہ کے ساتھ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مولانا حسرت کو شروط و قیود کی وہ طویل و عریض فہرست بھی مرحمت فرمائی تھی جن کی پابندی کے بغیر آزادی نہیں مل سکتی تھی، مگر شاید مولانا نے وہ شرطیں بیگم صاحبہ کو نہیں بھیجی تھیں، یا سنسر نے روک لی تھیں، بہر حال کئی روز تک کیا بلکہ کئی ہفتہ تک اس کا علم پبلک کو نہیں ہو سکا اور جو سرکاری کمیونک شائع کی گئی تھی اس میں صرف یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ حکومت چند شرطوں کے ساتھ حسرت کی بقیہ میعاد قید کو معاف کرنے کے لیے تیار تھی مگر انہوں نے منظور نہیں کیا۔

جب شرائط کی اشاعت میں زیادہ تعویق ہوئی تو بالآخر مسٹر چیتاستی نے کونسل میں سوال کیا کہ براہ مہربانی وہ شرطیں بتلائی جائیں لیکن اس پر بھی وہ شرطیں نہیں بتلائی گئیں لیکن پھر بعد میں ایک اور سوال کے جواب میں آخر کار حکومت کو وہ شرطیں ظاہر کرنی پڑیں جو حسب ذیل ہیں:

(۱) تم کو تا صدور حکم ثانی قصبہ کٹھور ضلع میرٹھ کی حدود میں کسی ایسے مکان میں جو مجسٹریٹ ضلع منظور کرے ٹھہرنا ہوگا۔

(۲) تم کو مجسٹریٹ ضلع یا اس کی جانب سے کسی حاکم با اختیار کی تحریری اجازت لیے بغیر مذکور حدود کے چھوڑنے کی اجازت نہیں۔

(۳) تم کو روزانہ ذاتی طور پر ۱۰ اور ۵ بجے کے درمیان بجز سخت بیماری یا انتہائی ضعف کے جس کی تمہیں افسر متعلقہ کو فوراً خبر کر دینی چاہیے افسر انچارج تھانہ کٹھور کو اپنی موجودگی کی رپورٹ کرنی ہوگی۔

(۴) تم کو اس کی ممانعت ہے کہ کسی ملاقاتی کو ان آخری حدود تک جن میں رہنے کی تم سے خواہش کی گئی ہے سورج نکلنے اور ڈوبنے کے درمیان لینے یا رخصت کرنے کے لیے جاؤ۔

(۵) تمہیں پولیس افسر انچارج کو ان سب لوگوں کے نام بتانے ہوں گے جو

تمہاری فرودگاہ پر آئیں، بجز باشندگان قصبہ مذکور اور ان لوگوں کے نام بھی بتانے ہوں گے جن کو تم خط کے علاوہ کسی اور طریقے سے پیغام بھیجو یا خطوط، اگر تم کو جبکہ پیام تمہیں (خط کے علاوہ کسی اور طریقے سے) ملیں اگر یہ پیام کسی شخص کے ذریعہ سے ملیں تو اس شخص کی تمہاری اقامت گاہ سے رخصت ہونے یا تمہارے پیام بھیجنے یا وصول کرنے سے تین گھنٹہ پیشتر تم کو اطلاع دینی چاہیے۔

(۶) تم ساری تار اشیاء ڈاک یا دستی خطوط کے جواب جو تمہارے پتہ پر آئیں بلا توقف اور بغیر کھولے ہوئے پولیس افسر مذکور کے پاس بھیج دو گے، تم کو کسی شخص کے ساتھ اس وقت تک تحریری مراسلت رکھنے کی بھی اجازت نہ ہوگی جب تک افسر مذکور اس خط و کتابت کی جانچ نہ کرلے۔

(۷) تم اس مکان میں جس میں رہنے کی تم سے خواہش کی گئی ہے وہاں کے افسر انچارج تھانہ مذکور یا مجسٹریٹ ضلع یا کسی افسر کو جو درجہ میں پولیس افسر انچارج تھانہ یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے بالا ہو تمام اوقات میں آزادی سے آنے جانے دو گے۔

یہ ہیں وہ شرطیں جن کی بنا پر بیگم صاحبہ حسرت موہانی نے اپنی تحریر میں لکھا ہے کہ نظری بندی سے قید ہر حال میں اچھی ہے۔

مگر ذرا چشم عبرت و تامل سے آغاز میموریل سے اس وقت تک کے واقعات و حالات کو دیکھا جائے تو اس وقت آپ اندازہ کرسکیں گے کہ ''وزنی حمایت والے'' میموریل پر ہمدردانہ توجہ جس کا وعدہ کیا گیا تھا کس عجیب عنوان کے ساتھ مولانا کے حال پر کی گئی۔

ایک ایسا میموریل جس پر صوبہ کے تمام بااثر اصحاب یعنی کونسل کے تمام غیر سرکاری آنریبل ممبران کے دستخط ہوں اور جس کو میموریل کے وزنی ہونے کا خود گورنمنٹ کو اعتراف ہو اور جس کی رسید میں یہ ظاہر کردیا گیا ہو کہ میموریل اپنی وزنی حمایت کے لحاظ سے

جس غور وتوجہ کا مستحق ہے وہ اس پر کی جائے گی، اور پھر اس میموریل کے جانے کے بعد مختلف آنریبل ممبران نے جو عاجزانہ سوالات کیے تھے نیز ملک وقوم اور خود بیگم صاحبہ حسرت موہانی کے مطالبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر شخص آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ کم از کم حکومت حسرت کو علی گڈھ میں اپنے مکان پر نظر بندی کی قیود کے ساتھ رہنے کی اجازت دے گی اور آنریبل پنڈت گوکرن ناتھ مصرا میموریل کی رسید موصول ہونے کے بعد اپنے ایک سوال میں ملک وقوم کی کم سے کم خواہش کو گورنمنٹ پر ظاہر کر چکے تھے کہ حسرت کو مناسب قیود کے ساتھ علی گڈھ میں رہنے کی اجازت دی جائے، لیکن ان تمام التجاؤں، عاجزانہ منتوں اور خوشامد طرازیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اول تو میموریل پر اس قدر غور وفکر کیا گیا کہ کئی ماہ اس میں گذر گئے اور جب غریب حسرت کی میعاد قید ختم ہونے کے بالکل قریب آ گئی یعنی بہ مشکل دو ڈھائی مہینہ باقی رہ گئے اس وقت ہمدردانہ غور وتوجہ کے یہ نتائج نکلے کہ کوئی خوددار آدمی اس کو منظور نہیں کر سکتا، موجودہ شرائط کے ساتھ کسی دوسرے مقام اور جیل میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، بلکہ ایسی سخت شرائط پر ہر شخص جیل ہی کو ترجیح دے گا۔

خصوصاً مولانا حسرت جیسا ضمیر وایمان پرست انسان جو پہلے ہی سے اس قانون اور اس کی پابندی کو ناجائز سمجھتا ہو وہ بھلا کیونکر گورنمنٹ کے ایسے فیصلے کو تسلیم کر سکتا ہے جس میں ذرہ برابر سابقہ حالات سے تجاوز نہ کیا گیا ہو، اور قصداً مولانا کی طبیعت کو ملحوظ رکھ کر ایسے احکام صادر کیے گئے ہوں جن کو وہ تسلیم کرنے سے بالکل معذور ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ انگریزی قوم کبھی دبتی نہیں ہے جس قدر اس کو مجبور کیا جاتا ہے اسی قدر اس کا عزم واستقلال بڑھتا ہے لیکن اس کے خلاف حسن طلب اور صلح وآشتی کے مقابلہ میں انگریز نرم ہو جاتے ہیں اور معاملات کو رفق ولینت کے ساتھ طے کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن مولانا حسرت کے معاملہ میں شروع سے آخر تک تمام واقعات پر غور کرتے

جایئے آپ کو کہیں بھی متانت وسنجیدگی کے خلاف یا حکومت کے ادب واحترام کے مخالف کوئی بات نظر نہ آئے گی لیکن باوجود اس کے حسرت کے معاملہ میں انگریزی کیریکٹر کی وہ خوبی آپ کو کہیں بھی نظر نہ آئے گی جس کے وہ مدعی ہیں۔

مولانا حسرت کے متعلق گورنمنٹ نے جو طرز عمل اختیار کیا گو وہ غیر متوقع نہ ہو لیکن واقعات کا استقراء کرنے سے مزید بدظنی و بدعقیدگی کی اسپرٹ پیدا ہونے کا احتمال ہے کیونکہ اس کے احکام میں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ قصداً ایسا طرز عمل اختیار کیا جائے جس سے حسرت اپنے ضمیر وایمان کے فیصلہ کو محفوظ رکھ کر مستفید نہ ہوسکیں۔

اس نام نہاد عطائے حریت وبخشش آزادی کو جس طرح بے نیازانہ انداز سے مولانا حسرت نے عطائے توبہ لقائے توبہ کہہ کر واپس کیا اور حکم حاکم کے جواب میں جو تحریر حسرت نے لکھی ہے وہ صرف حسرت ہی کا حصہ تھا، اور وہ ان کی عدیم المثال قوت ایمانی اور لازوال اعتماد علی اللہ کی ایک کھلی ہوئی نشانی ہے وہ لوگ جن کے قلوب وارواح ذوق ایمان کی شرینی سے محروم ہیں اور ذرا سی نگاہ کرم پر کتوں کی طرح پاؤں ٹٹولنے لگتے یا چشم عتاب آلود کی ایک ہی گردش میں صبر وثبات عزم وارادہ اور ایمان وضمیر کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، ان کو مولانا حسرت اور ان کی مقدس تحریروں سے درس عبرت حاصل کرنا چاہیے، یہی وہ مقام ابتلاء وآزمائش ہے جہاں کھوٹی اور کھری چیزیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور خلوص للّٰہیت اور نمود ونمائش دو جداگانہ حقیقتوں میں منقسم ہو جایا کرتی ہیں۔

بحر حال گورنمنٹ کی عنایت ونوازش کا جو دریا امڈا تھا اس کی موجوں کا شور بلند ہوا اور بلند ہو کر رہ گیا جو تشنہ کام تھے وہ اب بھی ویسے ہی العطش العطش کے فریادی ہیں۔

اس وقت تو مولانا حسرت اپنے پیشواؤں کی طرح "فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیَاةَ الدُّنْیَا"(۱) کی بشارت سے اطمینان قلب حاصل کر سکتے ہیں مگر کل اس

(۱) اس لیے تو کرلے جو تجھے کرنا ہو، تو تو صرف اس دنیوی زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔

کے عواقب وانجام سے کوئی وجود اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

۲۰ر فروری کو بخشش آزادی کا فرمان پیش گاہِ حکومت سے صادر ہوا تھا اور ۲۲ر مئی کو میعادِ قید ختم ہونے والی تھی یعنی کل تین ماہ کی قلیل مدت کے لیے یہ طوفانِ رحمت ورافت برپا ہوا تھا مگر ایک حقیر ذرہ کی خشکی کو سیرابی وتری سے تبدیل کیے بغیر جہاں سے یہ فتنہ اٹھا تھا پھر وہیں آکر ختم ہو گیا، تین ماہ کی مدت گو حکومت کے نزدیک بہت طویل ہو جس کو ختم کرانے کے لیے اس نے اپنے جذبۂ رحم کو حرکت دی تھی تاہم بلا کشان راہ حریت وآزادی کے نزدیک یہ مدت زیادہ وقعت نہیں رکھتی، چنانچہ بحمد للہ کہ حسرت نے نہایت صبر وسکون کے ساتھ اس زمانہ کو یہی ٹیفر کر دیا۔

۲۲ر مئی کی تاریخ اگر چہ آزادی ورہائی کا دن تھا مگر یوم مسرت وخوشی نہ تھا بلکہ ایک نیا مرحلہ امتحان وآزمائش تھا یعنی دوسال کی مسلسل قید کے بعد پھر از سر نو وہی منزل امتحان اور وہی محل آزمائش درپیش تھا یعنی جس وجہ سے آج سے دوسال قبل حسرت نے قانون تحفظ ہند کے احکام کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا وہی وجہ آج بھی موجود تھی اور ایمانی قوت و ضمیری فیصلہ میں آج بھی دوسال کی متواتر مصیبتوں اور کلفتوں کے برداشت کرنے کے بعد بھی کوئی ضعف وتزلزل واقع نہیں ہوا تھا، ایک طرف حکومت کی ضد اور زبردستی اپنی انتہائی طاقت کی نمائش کر رہی تھی، اور دوسری طرف ایمان وضمیر کی حق پرستی ودین شعاری اس کے مقابلے کے لیے تیار تھی۔

حسرت کے قدر دان مضطرب و پریشان تھے کہ کہیں یہ شہنشاہ اقلیم حریت وایمان پرستی پھر جیل کی پر صعوبت چار دیواری کے اندر مقید نہ کر دیا جائے، کیونکہ ایمانی کاروبار اور حق پرست ضمیر کے فیصلہ انسانی خود رائی وضد کے مقابلے میں کبھی زبون وخوار اور مغلوب و سرنگوں نہیں ہوا کرتے، دوسری طرف استبداد وجبر اپنی اعادہ قوت وطاقت کے لیے بالکل

آمادہ نظر آتی تھی، یعنی اپنے ۱۶ء کے فیصلہ نامنصفانہ کی یاد کو پھر ایک دفعہ ۲۲ رمئی ۱۸ء کو زندہ کرنے کے لیے تیار تھی۔

غرضیکہ حق و باطل، استبداد و حریت خود رائی و ضمیر پرستی کا ایک معرکہ تھا جو بظاہر ضعیف و ناتوان اور کمزور و بے سروسامان حسرت اور طاقت ور و مغرور حکومت کے درمیان درپیش تھا، شاید بعض کمزور ہستیاں اور وہ لوگ جن کو ایمان و ضمیر کی دولت نہیں ملی یا بہت کم ملی ہے وہ اس امر کے متوقع ہوں کہ اب دو سال کی سزائے قید کے مصائب و آلام برداشت کرنے کے بعد حکومت کی دانستہ یا نادانستہ ضد اور خود رائی کے مقابلہ میں حسرت اپنی سپر ڈال دیں گے مگر وہ لوگ جو لذت ایمان سے محروم اور قوت ضمیر کی نیرنگ سازیوں سے نا آشنا ہیں وہ حسرت کے عزم و استقلال کا اندازہ کیونکر لگا سکتے ہیں۔

بہر حال وہ آنے والی تاریخ آئی، اور حسرت نے اس معرکہ حق و باطل میں وہی کیا جس کی ان سے توقع تھی، حکومت نے ان کی میعادِ سزا ختم ہونے پر ان کو رہائی دی اور ساتھ ہی احکام نظر بندی بھی دینے چاہے مگر حسرت نے ان کو لینے سے یک قلم انکار کر دیا۔

اس موقعہ پر بیگم صاحبہ حسرت موہانی اور سینٹرل بیورو کے کارکن مسٹر تاج الدین اور نواب اسحاق خان صاحب قبلہ پہلے سے میرٹھ پہنچ گئے تھے، نواب صاحب قبلہ نے اس موقع پر بہت کچھ رفاقت کی اور مولانا حسرت کو چند روز کے لیے اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ بطور خود کٹھور میں قیام کر لیں، تاکہ اس عرصہ میں حکومت سے مزید گفتگو کی جا سکے۔

چنانچہ مولانا نے اپنی خوشی سے بطور خود چند روز کے واسطے چند روز کٹھور میں رہنا منظور فرما لیا، اور ایک تار گورنمنٹ کو دیا گیا کہ اگر حکومت نظر بندی کے احکام کا نوٹس جاری نہ کرے تو وہ اپنی خوشی سے کم و بیش حکومت کی شرطوں کا خیال رکھیں گے، یہی اس وقت بھی حسرت نے کہا تھا، جبکہ فرمانِ آزادی آج سے تین ماہ قبل صادر ہوا تھا، مگر اس دفعہ حکومت نے حسرت کی اس

شرط کو منظور کر کے جاری شدہ احکامات نظر بندی کو اٹھالیا اور نوٹس کو منسوخ کر دیا۔

اس کے بعد قاضی بشیر الدین صاحب مشیر قانونی اور آنریبل سید آل نبی کی معرفت ایک میموریل گورنمنٹ کی خدمت میں نینی تال روانہ کیا گیا اس میں گورنمنٹ سے خواہش کی گئی تھی کہ ان کو علی گڈھ میں رہنے کی اجازت دی جائے مگر حکومت نے اس کو منظور نہیں کیا، لیکن بجائے کٹھور کے میرٹھ میں رہنے کی اجازت دیدی تھی لیکن سعی و کوشش کا سلسلہ جاری رہا، ادھر تو عالی جناب نواب اسحاق خان صاحب گورنمنٹ کے پاس ایک وفد لے جانے کی فکر کر رہے تھے اور ادھر اس نازک موقع کے لیے پہلے ہی ہندوستان کے مشہور و ممتاز قوم پرست وکلاء اور بیرسٹروں کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس میں بفضلہ تعالیٰ بڑی حد تک کامیابی ہوئی اور پیروی مقدمہ کی تیاریاں تقریباً مکمل ہوگئی تھیں لیکن گورنمنٹ سے جو گفت و شنید جاری تھی اس کا بالآخر یہ نتیجہ نکلا کہ مولانا کو موہان میں رہنے کی اجازت دی گئی اور حکومت نے احکام نظر بندی جاری کرنے سے احتراز کیا، مگر مولانا ممدوح اصرار فرماتے رہے کہ ان کو دو چار دن کے لیے علی گڈھ جانے کی اجازت بھی دی جائے، گورنمنٹ اس خواہش کے پورا کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھی، اور شاید یہ ''راج ہٹ'' پھر معاملات کو پیچیدہ کر دیتی مگر آنریبل مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ آخر حکومت نے مولانا حسرت کو دو چار دن کے لیے علی گڈھ جانے کی اجازت دیدی

اس طرح بہت سی خرابیوں کے بعد آخر مولانا کے لیے یک گونہ سکون و اطمینان کی راہ کھل سکی، لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حکومت نے اس تمام کشمکش میں ایک لمحہ کے لیے بھی انصاف اور عدالت کا کوئی دل پذیر نمونہ پیش کیا ہو، ادھر ضد تھی اور ادھر قوت ایمانی، بہر حال اس عہد ابتلاء و مصائب میں ان لوگوں کے لیے جن کے دل مولانا کے مصائب پر خون ہو رہے تھے یہ جو کچھ کہ ہوا یہ بھی غنیمت ہے۔

رہائی کے وقت منجانب پولیس جو اہتمامات کیے گئے تھے ان کا معلوم کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا، حکومت کے نزدیک حسرت کا وجود اس قدر خطرناک سمجھا گیا تھا کہ جیل کے گردو پیش تمام سڑکوں اور ناکوں پر پولیس کا باقاعدہ پہرا قائم کر دیا گیا تھا تا کہ کوئی پرندہ پر تک نہ مار سکے، ہمدم اور جمہور کے نامہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مسلح پولیس کا اس قدر شاندار انتظام کیا گیا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا وائسرائے یا کوئی ایسا ہی افسر اعلیٰ اس طرف سے گذرنے والا تھا، اس ناکہ بندی اور پہرہ چوکی کا یہ اثر ہوا کہ میرٹھ کی کمزور طبیعت مخلوق سہم کر رہ گئی اور کسی کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ حسرت کے استقبال و پذیرائی کے لیے آگے بڑھتا۔

خدا معلوم حسرت کے وجود کے اندر وہ ایسی کیا خوفناک قوت برق موجود تھی جو ان سے نکل کر خرمن امن و امان کو نذر آتش کر دیتی، حکام میرٹھ کی یہ سختی سخت قابل اعتراض تھی کہ مسلمانوں کو اپنے ایک واجب الاحترام لیڈر کے استقبال و زیارت سے ان کو محروم کر دیا۔

موجودہ اسیری کے متعلق متفرق واقعات

اس نظر بندی و اسیری میں ابتداء جو سختیاں نامنصفیاں اور زبردستیاں حسرت کے ساتھ کی گئی ہیں ان کا ذکر ہم بہت اوپر کر چکے ہیں لیکن ابھی وہ سختیاں جو جیل کے اندر ان کے ساتھ اور ان سے متعلق اسیروں کے ساتھ کی گئی ہیں وہ باقی ہیں۔

میں پولیٹکل مجوسین کے ساتھ جینا توہین آمیز اور اعزاز نفس اور احترام ذاتی کے منافی سلوک و برتاؤ کیا جاتا ہے وہ بجائے خود نہایت قابل نفرت و حقارت ہے اور موجودہ عمران و مدنیت کے عہد میں ہندوستان کے لیے مخصوص ہے لیکن حسرت کے ساتھ جو غیر منصفیانہ سختیاں کی گئی ہیں وہ ہندوستان کے اندر بھی آپ اپنی مثال ہیں چنانچہ اس قسم کے ناجائز و ذلت آمیز طرز عمل سے مجبور ہو کر مولانا کو ایک دفعہ بطور پروٹیسٹ اور صدائے احتجاج کے الہ آباد جیل میں چار روز رکھنا وغیرہ ترک کرنا پڑا تھا بالآخر جب کئی وقت بغیر

کھائے پیئے گذر گئے تو مجسٹریٹ ضلع کو مجبوراً مولانا کا مطالبہ پورا کرنا پڑا، اور جس تکلیف میں ان کو مبتلا کر دیا گیا تھا اس سے نجات ملی۔

مہذب دنیا میں پولیٹیکل قیدیوں کو تمام قیدیوں سے ممتاز رکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کیا جاتا ہے، مگر یہاں مطلقاً اس بات کا پاس ولحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ حکام کو ان سے اور زیادہ بغض وعناد ہوتا ہے اور نسبتاً زیادہ سختی کی جاتی ہے چنانچہ عام قیدیوں سے ہفتہ میں ایک مرتبہ ان کے اعزاء واحباب مل سکتے ہیں لیکن حسرت کے ساتھ اس قدر سختی برتی گئی کہ اس دو سال کی طویل مدت میں بہت کم لوگوں کو موقع دیا گیا کہ ان سے مل سکیں اور ان کی تکلیف وآرام کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر سکیں، یہاں تک کہ جو لوگ ان سے ملنے یا ان کو کسی اپنے طریقے سے مدد پہنچانے کی غرض سے ان کے پاس گئے ان کے ساتھ بھی پولیس افسران اور صفائی حکام نہایت ذلت آفریں اور قابل نفرت وحقارت طریقہ سے پیش آئے، بلکہ ان پر ناجائز دباؤ ڈال کر اور ان کو طرح طرح دھمکیاں دے دے کر مولانا کی اعانت و نصرت سے باز رکھنا چاہا، ذیل میں اس بیان کے ثبوت کے طور پر ہم ایک مبنی بر واقعہ مراسلت درج کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولانا حسرت کے ساتھ بعض مقامی حکام کے ساتھ کیسا معاندانہ جذبہ اپنے اندر مخفی رکھتے ہیں، یہ مراسلت سعید افضال صاحب رضوی وکیل ہردوئی ضلع بارہ بنکی نے ۲۵ر اگست ۱۹۱۶ء کے اخبار ''نئی روشنی'' الہ آباد میں شائع کرائی تھی، موصوف مولانا حسرت کے مقدمہ اپیل کی پیروی کے لیے جھانسی تشریف لے گئے تھے اور وہاں جو واقعات پیش آئے ان کا اظہار اس مراسلت میں آپ نے کیا ہے:

> مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کی مظلومی اور درد اسلامی سے متاثر ہو کر میں نے پیروی اپیل کا ارادہ کیا، چنانچہ اپنے وطن ہردوئی سے سوار ہو کر ۱۸ر جون ۱۹۱۶ء کی شام کو قریب ۵ر بجے میل ٹرین سے جھانسی پہنچا اور سرا میں مقیم ہوا۔

حسب معمول پولیس آٹھ بجے شب کو مسافران سرا کا جائزہ لینے آئی مجھ سے بھی میرا نام و پتہ اور وجہ آمد جھانسی دریافت کی، میں نے اس وقت کہہ دیا کہ میں حسرت کی پیروی مقدمہ اپیل کے لیے آیا ہوں اور بشرط موقع وفرصت انجمن رفاہ المسلمین قصبہ ہردوئی کے لیے چندہ وصول کرنے کی بھی کوشش کروں گا۔

۱۹/ جون کو بذریعہ درخواست مولانا حسرت سے جیل میں ملاقات کی، واپس آیا، ۲۰/ کو پھر جیل گیا، مگر حسرت سے ملاقات نہ ہوسکی، ناکام واپس ہوکر سرا میں کھانا کھا رہا تھا کہ ایک کانسٹبل پولیس نے آکر کہا کہ سب انسپکٹر پولیس آپ کو بلا رہے ہیں، ناچار جانا پڑا، انھوں نے معمولی نام و پتہ وجہ قیام جھانسی دریافت کر کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس چلنے کو کہا، وہاں بھی گیا اس دربار کی کچھ گفتگو بطور مکالمہ تحریر کرتا ہوں:

مسٹر ایچ اے انگلش افسر پولیس: آپ کا نام؟

میں: افضال حسین رضوی

افسر پولیس: باپ کا نام

میں: مولوی سید محمد حسین رضوی

افسر پولیس: کہاں مکان ہے؟

میں: ہردوئی ضلع بارہ بنکی میں

افسر پولیس: کون تھانہ ہے؟

میں: بھلسر

افسر پولیس: یہاں کیوں آئے ہو؟

میں: مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کے مقدمہ کی پیروی

کے واسطے

افسر پولیس: حسرت آپ کا کون ہے؟

میں: میرا بھائی ہے۔

افسر پولیس: کیسا بھائی ہے؟

میں: وہ بھی مسلمان ہے میں بھی مسلمان ہوں وہ بھی ہندوستانی ہے میں بھی ہندوستانی ہوں، کوئی خاص رشتہ نہیں ہے۔

افسر پولیس: پھر ان کی پیروی مقدمہ کے لیے کیوں آیا؟

میں: محض بر بنائے اخوت و ہمدردی اسلامی۔

افسر پولیس: غضبناک ہو کر، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جھانسی کی آب و ہوا مسلمانوں کو ناموافق ہے، آپ یہاں کیوں آیا، جیل جائے گا تو پھر نہ آئے گا، آپ کو معلوم ہے کہ حسرت کس جرم کا مجرم ہے؟

میں: نہیں، میں: کیا خود مجرم بھی اپنے جرم سے ناواقف ہے؟ اس پر افسر نے میری نسبت بہت ہی غیر مہذب اور نا ملائم الفاظ استعمال کر کے اور سخت بگڑ کر کہا کہ دل تم کو نہیں معلوم۔

افسر پولیس: آپ چندہ بھی وصول کریں گے حسرت کے واسطے؟

میں: نہیں حسرت کے لیے نہیں، بلکہ انجمن رفاہ المسلمین قصبہ ہردوئی ضلع بارہ بنکی کے لیے، وہ بھی بشرط سہولت و موقع، وصول چندہ کا ثبوت طلب کرنے پر میں نے انجن کا ایک مطبوعہ اشتہار دکھا دیا جس کے بعد گفتگو ختم ہوگئی اور مجھے صاحب کلکٹر بہادر جھانسی کے پاس جانے کی ہدایت ہوئی، وہاں بھی مجھ سے حال دریافت کیا گیا مگر پرایہ متانت اور تہذیب کے ساتھ اور آخری حکم یہ ملا کہ میں تا حکم ثانی حدود میونسپلٹی سے باہر نہ جاؤں، میں نے اس کی پابندی کی مگر پولیس کی نگرانی خفیہ و علانیہ

قائم رہی، کئی دن کے بعد یہ حکم اٹھا لیا گیا اور اب بظاہر میں آزاد تھا، مقدمہ کی تاریخ یکم جولائی ۱۹۱۶ء مقرر تھی، تاریخ مذکور پر اخراج اپیل کا حکم سننے کے بعد نقل لے کر وطن واپس آنے کا ارادہ تھا کہ وہی ننھے خان کانسٹبل جو پہلے دن میری عیادت کو آئے تھے پھر میرے پاس آئے اور حکم نادری سنایا کہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا کہ آپ فوراً جھانسی سے چلے جایئے ورنہ اچھا نہ ہوگا، میں نے کہا کہ نقل اخراج اپیل لے کر اور میرے پاس خرچ نہیں ہے مکان سے یا علی گڈھ سے خرچ آنے پر جس کے آنے کی امید ہے واپس جاؤں گا، اگر ایسا نہیں ہوسکتا اور میرا چلا جانا ناگزیر ہو تو مجھے حکم تحریری لادو اور سرکار ریل کا ٹکٹ بھی خرید کر مجھ کو دے میں جھانسی ابھی چھوڑتا ہوں۔

بہر حال نقل لینے کے بعد ۵/ جولائی کو میں جھانسی سے روانہ ہو کر اپنے وطن ہردوئی صحیح سالم پہنچا، بیگم صاحبہ حسرت موہانی کا ایک پرائیویٹ خط میرے پاس تھا جس کو کانسٹبل پولیس لے گیا مگر باوجود اس کے کہ وہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مجھ سے واپسی کا وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک وہ خط مجھ کو نہیں ملا ہے اب جائے انصاف ہے کہ افسر پولیس کا اسے نامناسب الفاظ استعمال کرنا جائز تھا یا ناجائز؟۔

خادم قوم کمترین سید افضال حسین رضوی ساکن محلہ سالار قصبہ ہردوئی ضلع بارہ بنکی

اس مراسلت کی ایک ایک حرف کو دیکھ کر اور پھر حکام اور حکومت کے اس طرز عمل پر غور کیجئے جو وہ حسرت کے معاملہ میں اختیار کیے ہوئے ہیں جب ایک ایسے شخص کے ساتھ جو صرف حسرت کے مقدمہ کی پیروی کرنا چاہتا ہو ایسا معاندانہ سلوک کیا جائے اور صرف اس ایک جرم میں کہ وہ مظلوم حسرت کا ہمدرد ہو ایسی سختی و درشتی کی جائے اور ایسا غیر مہذب طرز عمل اختیار کیا جائے تو اس سے آپ ان سختیوں اور سخت گیریوں کا اندازہ کر سکتے ہیں جو خود

غریب حسرت کے ساتھ کی گئی ہوں گی۔

اس قسم کی سخت گیریوں کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ اور بہت سے لوگوں نے ملنا چاہا مگر بہت کم لوگوں کو اجازت ملی مثلاً ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری اور مسٹر تاج الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ سینٹرل بیورو نے ملنے کی اجازت طلب کی تا کہ ان کے مالی معاملات درست کرنے کے لیے ان سے مشورہ کریں مگر حکومت نے ان کو ملنے کی اجازت نہیں دی، اسی طرح لکھنؤ جیل میں پانچ ہندو مسلمان معززین نے مولانا سے ملنے کی خواہش کی اس میں مرحوم راجہ غلام حسین صاحب بھی تھے مگر لکھنؤ کے ڈپٹی کمشنر صاحب نے ان کو بھی ملنے سے روک دیا اس واقعہ پر معزز انگریزی اخبار لیڈر نے لکھا تھا: ''آیا یہ فعل جاپلنگ نے اپنی ذمہ داری سے کیا ہے یا حکام اعلیٰ کی منظوری سے کیا ایک ستم رسیدہ محبّ وطن سے ان پانچوں آدمیوں کی ملاقات سے گومتی میں آگ لگ جاتی یا جیل خانہ کی ڈسپلن میں ابتری پیدا ہو جاتی؟ کیا گورنمنٹ کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ سیاسی آراء سے قطع نظر کر کے قوم حسرت موہانی کی قدر و منزلت ان کے اعلیٰ کیریکٹر اور بے ریا حب وطن کی وجہ سے کرتی ہے، اگر گورنمنٹ ناواقف ہے، تو خفیہ پولیس کا محکمہ جس پر ہزاروں روپیہ صرف کیے جاتے ہیں کس قسم کی اطلاعیں اس کو بہم پہنچاتا ہے، ایک حکومت کو ان معمولی باتوں سے بلند ہونا چاہیے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ حکومت کا منشاء اور اس کی مصلحت اس روک تھام سے کیا تھی؟ اور کیا ہے؟ البتہ اس سے مولانا حسرت کا جس قدر نقصان ہوا وہ افسوسناک ہے کیونکہ کوئی شخص ان سے ان کے کاروبار کے متعلق مشورہ نہ کر سکا اس کے علاوہ ان کی تکالیف کا بھی کم لوگوں کو علم ہو سکے کہ اس کے رفع کرنے کی کوشش کی جاتی۔

❖❖❖❖

آخری حالات (۱)

مولانا میرٹھ میں عرصہ تک اس حالت میں قیام فرمارہے کہ گورنمنٹ کے عائد کردہ قیود سے ان کو کوئی واسطہ نہ رہا، صرف اپنی خوشی سے اس بات کا لحاظ رکھا کہ کسی قسم کی شکایت حکومت کو نہ پیدا ہو، لیکن خدا معلوم کن وجوہ کی بنا پر حاکم ضلع میرٹھ کی یہ خواہش رہی کہ وہ میرٹھ میں نہ رہیں، اور یا تو کٹھور میں چلے جائیں یا اپنے وطن۔ مولانا کٹھور جانے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ وطن اسی شرط کے ساتھ جانا چاہتے تھے کہ راستہ میں دو ایک روز کے لیے علی گڈھ میں ٹھہرنے کی اجازت دی جائے، مگر اس میں بہت تشویش ہوئی، زبانی آنریبل مرزا سمیع اللہ بیگ نے چیف سکریٹری حکومت صوبۂ متحدہ نے وعدہ کرلیا کہ مگر عرصہ تک اس کی باضابطہ تکمیل نہیں ہوئی، غرضیکہ اسی وجہ سے بہت عرصہ تک مولانا کو میرٹھ میں قیام کرنا پڑا اور بعض اوقات کچھ ایسی صورتیں پیدا ہوگئیں کہ مولانا کو خیال ہوا کہ پھر از سر نو وہی ابتدائی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی لیکن بفضلہٖ تعالیٰ یہ نوبت نہیں آنے پائی اور مولانا میرٹھ سے اپنے وطن موہان چلے گئے (۲)، یہاں دو تین ماہ قیام رہا، اس عرصہ میں حکومت کی طرف سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ الاؤنس مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا مگر آپ نے اس کو منظور نہیں فرمایا اور اس رقم کے لینے سے انکار کر دیا۔

دسمبر کے دوسرے ہفتہ میں آخر کار وہ قیود بھی مولانا سے اٹھائی گئیں جن کے بطور خود لحاظ رکھنے کا مولانا نے وعدہ کیا تھا اور تمام طور سے نقل وحرکت کی اجازت دے دی گئی، چنانچہ آپ کانگریس لیگ کی شرکت کے لیے دہلی تشریف لانے والے ہیں، جہاں لوگوں کو مولانا کی زیارت کا موقع ملے گا۔

---

(۱) اپریل ۱۹۱۶ء کے اواخر میں حکومت حسرت کو درج ذیل شرائط پر رہا کرنے پر راضی ہوگئی، حسرت موہانی میں ۷ رشرطوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ (حسرت موہانی مرتبہ خلیق انجم، ص: ۱۵۷)

(۲) ہمدم لکھنؤ ص: ۲، ۹ رجون ۱۹۱۸ء، بحوالہ بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط ص: ۹۲

مولانا کی لائف حقیقتاً اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک کہ بیگم صاحبہ حسرت کے حالات وواقعات شامل نہ کیے جائیں کیونکہ بیگم صاحبہ مولانا کی زندگی میں ہر طرح سے شریک ہیں اور مولانا کے کاروبار قومی میں ہمیشہ معین ومعاون رہی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر بیگم صاحبہ کی مستقل مزاجی اور مولانا کے ساتھ ان کی ہم خیالی شریک حال نہ ہوتی تو مولانا حسرت اس قدر عزم وثبات کا شاید ثبوت پیش کرنے سے قاصر رہتے۔

افسوس ہے کہ تفصیل کے ساتھ بیگم صاحبہ کی وہ خدمات نہیں درج کر سکتے جو وقتاً فوقتاً بیگم صاحبہ نے انجام دیں اور حسرت کی قوت ایمانی میں اضافہ کیا۔

بہر حال بیگم صاحبہ اس بعد حاضر کی ان خواتین میں سے ہیں جن کے اگر حالات و واقعات پردۂ راز سے کبھی باہر لائے گئے تو دنیا محو حیرت رہ جائے گی۔

آخر میں خداوند ارض وسماء سے دعا ہے کہ وہ اپنی نصرت سے مولانا اور ان کی بیگم صاحبہ کو پھر خدمت قومی کی منصب وتوفیق عطا فرمائے اور ان کو حوادث روزگار سے محفوظ رکھے(۱)۔ آمین ثم آمین

---

(۱) حسرت کی وفات: علامہ سید سلیمان ندویؒ نے حسرت کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: حسرت مرحوم ابھی چند ماہ ہوئے کہ اسی ۱۳۶۹ھ کے حج سے فارغ ہوکر جدہ سے کراچی آئے تھے۔ دیکھا کہ ان کا گداز جسم ضعف سے سکڑ گیا ہے، اس وقت خیال آیا کہ یہ حضرت بھی جگہ خالی کرنے والے ہیں۔ (حسرت کی سیاسی زندگی ص:۱۱۱)

مشمولہ نگار، حسرت نمبر۔ نیشنل ہیرالڈ (لکھنؤ) نے اپنی ۱۴ رمئی ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں پہلے صفحے کے چوتھے کالم میں مولانا حسرت موہانی کی وفات کی خبر ان الفاظ میں شائع ہوئی۔

"لکھنؤ، اتوار آج ۱۳ رمئی ۱۹۵۱ء دوپہر بارہ بج کر ۳۵ رمنٹ پر فرنگی محل میں طویل علالت کے بعد مولانا حسرت موہانی کا انتقال ہوگیا۔ (حسرت موہانی ص:۲۰۹، خلیق انجم)